حقیقت

توحید و رسالت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

مِنہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695

www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

نام کتاب	:	حقیقتِ توحید و رسالت
خطابات	:	ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	:	ضیاء نیر
پروف ریڈنگ	:	عبدالجبار قمر
کمپوزنگ	:	محمد یامین (منہاجین)
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّتؒ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ www.Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
نگرانِ طباعت	:	محمد جاوید کھٹانہ (منہاجین)
اِشاعت اوّل	:	جنوری 1988ء 2,000
اِشاعت دوم	:	اکتوبر 1994ء 2,000
اِشاعت سوم	:	جون 2000ء 1,100
اِشاعت چہارم	:	نومبر 2002ء 1,100
اِشاعت پنجم	:	اکتوبر 2004ء 1,100
قیمت	:	90/- روپے

ISBN # 969-32-0277-5

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلیکیشنز)

sales@minhaj.biz

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَولَایَ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

فَھُوَ الَّذِیْ تَمَّ مَعْنَاہُ وَ صُوْرَتُہٗ

ثُمَّ اصْطَفَاہُ حَبِیْبًا بَارِئُ النَّسَمِ

﴿صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ أَصْحَابِہٖ وَ بَارَکَ وَسَلَّمَ﴾

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴-۱/ ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل و ایم ۴/ ۹۷۰-۳-۷، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔۱/ اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱/ ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	**باب اول......شہادت توحید**	۹
	شہادت توحید کے دو پہلو	۱۲
	شہادت توحید کا منفی ......اور......اثباتی پہلو	۱۳
۲	مختلف مادہ ہائے اشتقاق کی رو سے لفظ الٰہ کا مفہوم	۱۴
	پہلا مادہ اشتقاق ......الہ (عبادت کرنا)	۱۴
	دوسرا مادہ اشتقاق ......الہ (تحیر و درماندگی)	۱۶
	تیسرا مادہ اشتقاق ......الہ (سکون پانا)	۲۱
	چوتھا مادہ اشتقاق ......الولہ (عقل کا گم ہونا)	۲۷
	پانچواں مادہ اشتقاق ......لاۃ (بلندی و ارتفاع)	۲۹
	چھٹا مادہ اشتقاق ......لاہ یلوہ (مخفی ہونا)	۳۱
	ساتواں مادہ اشتقاق ......الہ (عطا کرنا، اجرت دینا)	۳۵
	آٹھواں مادہ اشتقاق ......الہ (عطا کرنا، اجرت دینا)	۳۷
	الہ کا نواں مرادی مفہوم	۳۹
	الہ کے جملہ مفاہیم کا مجموعی تاثر	۴۲
۳	لفظ اللہ کا مفہوم	۴۳
	شہادتِ توحید کا مفہوم	۴۴
	لفظ اللہ کا ہر حرف معنوی دلالت میں کامل ہے	۴۴
	واجب الوجود ہستی	۴۵
۴	دلائل توحید	۴۶
	توحید کے نظری دلائل	۴۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	توحید کے مشاہداتی دلائل	۵۰
	اثبات توحید کے خاموش دلائل	۵۴
	اثبات پر نفی کو مقدم کرنے کی حکمت	۵۶
	شرک کا مفہوم اور اس کے مضمرات	۵۷
	شہادت کا مفہوم	۵۹
	اقسامِ شہادت	۶۲
	عقیدہ توحید اور تصورِ وحدت میں امتیاز	۶۲
۵	**باب دوم۔۔۔۔حقیقت عبدیت محمدی ﷺ**	۶۴
	لفظ عبد کے مفہوم کے بارے میں مغالطہ اور اس کا ازالہ	۶۷
	کلمہ شہادت میں عبدیت محمدی ﷺ کا تقدم	۶۸
	شہادت رسالت پر شہادت عبدیت کو مقدم کرنے کے اسباب	۷۰
	حقیقت مقام عبدیت	۷۲
۶	قصہ آدم علیہ السلام میں نیابت خداوندی کا تصور	۷۳
	حضرت آدم علیہ السلام اور صدور نسیان	۷۴
	خلافت ارضی کے لئے تربیت آدم کے حکمت آموز پہلو	۷۵
۷	حضرت آدم علیہ السلام کا مقام عبدیت	۷۷
	حضرت نوح علیہ السلام اور مقام عبدیت	۷۸
	حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مقام عبدیت	۷۹
	حضرت سلیمان علیہ السلام اور مقام عبدیت	۸۰
	حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مقام عبدیت	۸۱
	حضور اکرم ﷺ اور مقام عبدیت	۸۱

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین	۸۳
	پاکانِ امت اور عرفائے کاملین	۸۶
	عبدیت مصطفوی ﷺ اور کم فہموں کو کوتاہ نظری	۸۸
۸	مقامِ عبدیت اور عبد کی اقسام	۹۰
	شانِ عبدیت اور شانِ محبوبیت کا تقابل	۹۱
	کمالِ عبدیت مصطفوی ﷺ	۹۲
	شانِ عبدیت پر ایک تمثیل	۹۳
۹	شانِ محبوبیت	۹۵
	شانِ عبدیت اور شانِ محبوبیت ......زاویہ نگاہ کا فرق	۹۶
	شانِ محبوبیت...... حدیث مبارکہ کی روشنی میں	۹۷
	شانِ محبوبیت اور شانِ عبدیت کا باہمی تعلق	۹۹
	شانِ محبوبیت اور شانِ عبدیت کی وضاحت ایک تمثیل کے ذریعے	۱۰۰
۱۰	**باب سوم...... حقیقت رسالت محمدی ﷺ**	۱۰۲
	عبدیتِ کاملہ کے مدارج	۱۰۵
	مقامِ رسالت کے مدارج	۱۰۶
	تحویلِ کعبہ...... مقام رضا کا مظہر	۱۰۷
	ذکرِ مصطفیٰ ﷺ ہر چیز سے بلند تر ہے	۱۱۱
	حضور ﷺ کو اپنی ذات پر قیاس کرنا متاعِ ایمان کو غارت کر دیتا ہے	۱۰۹
	حلقہ بگوشئ مصطفیٰ ﷺ ...... محبوبیت کا پہلا زینہ	۱۱۲
۱۱	خدا و مصطفےٰ ﷺ کے باہمی تعلق پر قرآنی ارشادات	۱۱۳
	کوئی عملِ خیر نسبتِ مصطفوی ﷺ کے بغیر مقبول نہیں	۱۱۵

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۱۷	واسطہ رسالت ہی توحید باری تعالیٰ کی اولین و آخرین دلیل ہے	
۱۱۸	ایمان بالرسالت ایمان بالتوحید کے لئے لازمی شرط ہے	
۱۲۲	قرآن وسنت میں سے ایک کا انکار دوسرے سے انکار کے مترادف ہے	
۱۲۳	توحید ورسالت ایک ہی نورلم یزل کی شعاعیں ہیں	
۱۲۴	نسبت رسالت ......خدا کی نظر میں	
۱۲۵	حرف آخر	
۱۲۶	**باب چہارم......مقام نبوت کی دو جہتیں**	۱۲
۱۲۶	عبدیت اور رسالت	
۱۳۰	باعتبار توجہ نبوت کی دو جہتیں	
۱۳۰	توجہ الی اللہ	
۱۳۰	توجہ الی الخلق	
۱۳۱	نبوت کی جہت عروج	
۱۳۱	نبوت کی جہت نزول	
۱۳۳	گنہگار اور صالح بندوں کو مژدہ سلامتی	
۱۳۴	حضور ﷺ مثلیت وفضلیت اور غلط فہمیوں کا ازالہ	۱۳
۱۳۸	مثلیت اور فضلیت کی جہتیں اور ایمان کا تقاضا	
۱۴۰	مقام مصطفوی ﷺ کی وضاحت کے لئے ایک مثال	
	اشاریہ	۱۴
	کتابیات	۱۵

باب اول

شہادت توحید

ارکان اسلام میں تصور توحید بلاشبہ بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اسلامی نظریہ حیات اسی تصور کو انسان کے رگ و پے میں اتارنے اور اس کے قلب و باطن میں جاگزیں کرنے سے متحقق ہوتا ہے۔ تصور توحید کی اساس تمام معبودان باطلہ کے بطلان و نفی اور ایک خدائے بے ہمتا کی الوہیت کے تحقق و اثبات پر ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ نے ایمان کے بنیادی تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

بنی الاسلام علی خمس شهاده ان لا اله الا الله و ان محمدا عبده و ایتاء الزکوة والحج و صوم رمضان۔	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج ادا کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔
۱۔ صحیح البخاری، ۱:۲، ۲۔ کتاب الایمان، رقم:۸	
۲۔ صحیح لمسلم، ۱:۳۲، کتاب الایمان، رقم:۲۰	

اس حدیث مبارکہ میں جن پانچ چیزیوں کو بنیاد اسلام قرار دیا گیا ہے، اصطلاح شریعت میں انہیں اسلام کے ارکان خمسہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہی ارکان خمسہ حدیث جبریل میں بھی مذکور ہیں اور متعدد روایات میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے اور انہی کی بطریق احسن ادائیگی کی وجہ سے ان پر لفظ اسلام کا اطلاق ہوتا ہے۔

شہادت توحید:

اسلام کا رکن اول شہادت توحید و رسالت ہے۔ زیر نظر باب میں ہمارا بیان صرف شہادت توحید پر مرکوز ہوگا جبکہ آئندہ ابواب میں انشاء اللہ شہادت رسالت پر روشنی

ڈالی جائے گی۔ شہادت توحید سے مراد یہ ہے کہ مسلمان زبان اور دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کی گواہی دے۔ اس کی ذات وصفات میں کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔

اسلام کا رکن اول کلمہ شہادت ہے جو بایں الفاظ مذکور ہے۔

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا عبده و رسوله۔	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

شہادت توحید و رسالت کے لئے محض کلمہ طیبہ کا رسمی اعلان اور زبانی اقرار ہی کافی نہیں کیونکہ کسی شخص کا اپنی زبان سے کلمہ طیبہ ادا کر دینا اور بات ہے اور دل و زبان کی ہم آہنگی سے اس کی شہادت دینا اور بات' ایمان فی الحقیقت اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کا نام ہے۔ دلی تصدیق کے بغیر محض زبانی اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا کہ بقول اقبالؒ

؎ زباں نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شہادت توحید کے دو پہلو:

شہادت توحید کے دو پہلو ہیں ان میں ایک منفی اور دوسرا مثبت پہلو ہے۔ شہادت توحید کے لئے ضروری ہے کہ نفی و اثبات دونوں پہلوؤں پر عمل کیا جائے۔

۱۔ شہادت توحید کا منفی پہلو:

شہادت توحید کا پہلا حصہ نفی ما سوا اللہ پر مشتمل ہے' جس کا مفہوم اس بات کا مقتضی ہے کہ بندہ اپنے قلب و باطن کی اتھاہ گہرائیوں سے کائنات ارض و سما میں موجود ہر

چھوٹی بڑی اور ادنیٰ و اعلیٰ مخلوق کی الوہیت کے ہر امکان کی کلی طور پر نفی کر دے اور یہ اقرار کرے کہ کائنات ہست و بود کی کوئی بھی چیز اصلاً بالفعل یا بالقوہ اسے نقصان پہنچانے پر قدرت نہیں رکھتی، نیز وہ اس امر کی گواہی دے کہ شجر و حجر، شمس و قمر، جمادات و نباتات، جن و انس، ملائکہ اور مظاہر فطرت میں سے کوئی بھی اس کا معبود و مسجود ہونے کے اہل و سزاوار نہیں۔ ارض و سماوی کائنات کی یہ اشیاء تو اپنی جگہ خود محکوم ہیں جو ایک غالب اور زبردست ہستی کا حکم بجا لانے کی پابند ہیں۔ از روئے ارشاد باری اپنے اپنے حال کی مناسبت سے ہر وجود ایک غالب و کار آفریں ذات کے آگے برضا و بالجبر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔

وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا۔ (آل عمران، ۳:۸۳)	اور جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہے اس نے خوشی سے یا لاچاری سے (بہرحال) اسی کی فرمانبرداری اختیار کی ہے۔

۲۔ شہادت توحید کا اثباتی پہلو:

شہادت توحید کا دوسرا حصہ ''الا اللہ'' ہے جس کے اثباتی پہلو کا مفہوم یہ ہے کہ الوہیت کی نفی کا اطلاق ہر وجود پر نہیں ہوتا، کیونکہ کائنات میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جو انسان اور دیگر مخلوقات ارض و سماوی کی معبود و مسجود ہونے کی بنا پر حقدار و سزاوار الوہیت ہے۔ اور وہی بنی نوع انسان کو نفع و نقصان پہنچانے پر قادر ہے کہ تنہا وہی ذات ہر ذی حیات و غیر ذی حیات کی خالق و مالک ہے اور مطاع مطلق اور مختار کل ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے نظام بندگی میں جکڑا ہوا ہے، یہ ذات بابرکات اللہ رب العزت کی ہے۔

نفی و اثبات پر مشتمل اقرار کی ان دو جہتوں کی تکمیل ہی سے شہادت توحید کا

مضمون مکمل ہوتا ہے اگر محض نفی ہو اور اس کے ساتھ اثبات کا پہلو نہ ہو یا محض اثبات اور ماسوا اللہ کی نفی نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں اسلام کے رکن اول میں شہادت توحید کا پہلو نامکمل اور ادھورا رہے گا۔

لفظ الٰہ اور اس کا مفہوم:

بنظر غائر دیکھا جائے تو شہادت توحید میں ایک لفظ بڑی اہمیت رکھتا ہے جس سے ہر غیر اللہ کی الوہیت کی نفی اور صرف ایک ذات کی الوہیت کا اثبات ہو رہا ہے' یہ الٰہ کا لفظ ہے جو قرآن حکیم میں بکثرت استعمال ہوا اب قرآن مجید میں موجود آیات کی استشہاد کی روشنی میں لفظ الٰہ کا لغوی و اصطلاحی معنی درج ذیل ہے۔

مختلف مادہ ہائے اشتقاق کی رو سے لفظ الٰہ کا مفہوم:

اہل علم کے مطابق اپنے مفہوم کے اعتبار سے لفظ الٰہ درج ذیل مشتقات سے عبارت ہے۔

پہلا مادہ اشتقاق۔ اَلَہَ (عبادت کرنا):

اس لفظ کے کئی مادے بیان کئے گئے ہیں' چنانچہ اس کے لغوی اشتقاق کے سلسلہ میں علماء کا ایک قول ہے کہ یہ اَ لَہَ یا لَہُ سے مشتق ہے اس کا معنی عبادت کرنا ہے اس طرح الٰہ کا معنی معبود (جس کی عبادت کی جائے) قرار پایا۔ زمانہ قدیم میں سورج کی پرستش کرنے والوں نے سورج کا نام الھتہ رکھا ہوا تھا اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی کہ وہ اسے معبود تصور کرتے تھے۔ امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ الٰہ معبود سے عبارت نہیں بلکہ اس کی دلالت اس وجود یا ہستی پر ہوتی ہے جو خود معبود ہونے کی اہل اور مستحق

ہو۔قرآن حکیم میں لفظ الٰہ اکثر و بیشتر معبود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔قرآن مجید کی چند آیات بطور استشہاد پیش کی جاتی ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

۱۔اِذْ قَالَ لِبَنِیۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَکَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَO

(البقرۃ ۲ : ۱۳۳)

جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم (سب) اسی کے فرمانبردار رہیں گےo

۲۔قَالَ یَا قَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَO

(الاعراف ۷:۶۵)

انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم پرہیز گار نہیں بنتے؟

۳۔وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِO

(الانبیاء ۲۱:۲۵)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری عبادت کیا کروo

اس مادہ اشتقاق کی بنا پر لفظ الٰہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ اکیلی ذات جو مستحق عبادت ہے جو اپنے وجود و کمال میں اس قدر جامع، اکمل اور اتم ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے کے لئے پرستش کے لائق ہے، جو خود واجب ہے اور باقی سب ممکن، جو خود خالق ہے اور باقی سب مخلوق، جو خود باقی ہے اور باقی سب فانی، جو خود قدیم ہے اور باقی سب حادث، جو خود غنی ہے اور باقی سب محتاج، جو خود ازلی و ابدی ہے، اول و آخر ہے اور ظاہر و باطن ہے اور جو کچھ اس کائنات کے نقطہ آغاز سے لے کر نقطہ انجام تک وجود میں آ رہا ہے اسی کے فیضان ربوبیت کا پرتو ہے چونکہ کائنات کی ہر چیز اپنے ہونے، باقی رہنے اور کمال پانے میں اس کی محتاج ہے، اس لئے اس کے سوا کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں، کیونکہ جو محتاج ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا۔

دوسرا مادہ اشتقاق۔ اَلِهَ (تحیر و درماندگی):

لفظ الٰہ کے اشتقاق میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اَلِهَ سے ماخوذ ہے اس کا معنی تحیر و درماندگی ہے۔ رب ذوالجلال کے لئے اس لفظ کا اسم قرار پا جانا اس کی عظمت اور علو مرتبت کی صحیح نشاندہی ہے۔ کیونکہ انسان ذات باری تعالیٰ کے بارے میں جو کچھ زیادہ سے زیادہ جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور فہم و ادراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور کرے گا اس کی حیرت و استعجاب میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ معرفت الٰہی کی ابتداء بھی عجز و حیرت تھی اور انتہا بھی عجز و حیرت ہے

؎ اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من

حواس انسانی ذات حق کا ادراک نہیں کر سکتے۔ عقل انسانی اس کے فہم سے قاصر ہے، کشف و وجدان اس کی کامل معرفت سے عاجز ہیں۔ انسان جب اپنی تمام ظاہری و باطنی صلاحیتوں اور نفسی استعدادوں کو بروئے کار لا کر بھی اس حسن مطلق کے جلوؤں کا صحیح نظارہ نہیں کر سکتا اور اس حقیقت ابدی کو اپنے دامن عقل وفہم میں سمو نہیں سکتا تو اس کی زبان بیساختہ پکار اٹھتی ہے "ما عرفنک حق معرفتک" (اے حسن ازل ہم تجھے اس طرح نہیں جان سکے جیسے جاننے کا حق تھا)

اس لئے کہ وہ کل ہے اور باقی سب جزو، وہ خود محیط ہے اور باقی سب محاط، وہ غیر محدود اور باقی سب محدود، اس کی حقیقت سب جاننے والوں کی سرحد ادراک سے ماورا ہے اور اس کی ہستی سب دیکھنے والوں کی منتہائے نظر سے بلند و بالا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی جا بجا آیات اللہ (خدا کی نشانیوں) میں غور وفکر اور تعقل و تدبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

۱۔لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ O	نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ بڑا باریک بین بڑا باخبر ہے۔

(الانعام، ۶:۱۰۳)

اس لئے حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تفکروا فی ألاء الله ولا تفکروا فی الله۔	اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرو اور ذات باری تعالیٰ میں غور وفکر نہ کرو۔

۱۔مجمع الزوائد، ۱:۸۱

۲۔الجامع الصغیر، ۱:۱۳۲

۲۔مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذَالِکَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَO اِنَّ فِيْ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَO

(يونس، ١٠:٦۔٥)

اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا فرمایا مگر درست تدبیر کے ساتھ وہ (ان کائناتی حقیقتوں کے ذریعے اپنی خالقیت، وحدانیت اور قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لئے تفصیل سے واضح فرماتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔ بے شک رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور ان (جملہ) چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا فرمائی ہیں (اسی طرح) ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو تقویٰ اختیار کرتے ہیںo

اسی طرح ارشاد فرمایا۔

۳۔سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِيْ الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔

(حٰمٓ السجدہ، ٤١:٥٣)

ہم انہیں جلد ہی کائنات میں اور ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھا دیں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

٤۔اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔

(الروم، ٣٠:٨)

کیا وہ اپنے نفوس میں تفکر نہیں کرتے۔

۵۔كَذَالِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَO

(البقرۃ‘۲:۲۱۹)

اسی طرح اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم غور وفکر کروo

۶۔اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِO

(آل عمران‘۳:۱۹۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اسکی عظمت اور حسن کے جلووں) میں فکر کرتے رہتے ہیں۔(پھر اس کی معرفت سے لذت آشنا ہوکر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

متذکرہ بالا آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ عالم کون و مکان میں کارفرما قدرت کی نشانیوں میں غور وفکر سے ہستیِ باری تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے اور اس کی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے‘ جوں جوں انسان انفس و آفاق کی آیات وعلامات کے فکر میں منہمک

ہوتا چلا جاتا ہے اس پر ذات حق کی عظمتیں اور سطوتیں مزید آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور وہ تحیر و استعجاب کے سمندر میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر عالم حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔صوفیا کے نزدیک معرفت کے منزلوں میں اس مقام حیرت کو نہایت بلند درجہ حاصل ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ عرفا طویل طویل مدت تک آیات الٰہیہ میں غور و فکر کرتے ہوئے مقام حیرت میں اس طرح گم کھڑے رہے کہ اس محویت میں نہ انہیں اپنی خبر رہی نہ دنیا کی، حتیٰ کہ یہی حیرت منتہائے معرفت قرار پا گئی۔لیکن اس درجہ تک بھی عقل کو نہیں عشق و محبت ہی کو رسائی حاصل ہوتی ہے بقول اقبال

؎ بو علی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

اسی لئے علامہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

؎ گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

دنیا کے تمام عرفا اور حکما اس امر پر متفق رہے ہیں کہ آگہی کی انتہا بے خبری ہے اور علم کا آخری نقطہ کمال لاعلمی ہے۔ جب چشم علم و معرفت پر تمام حجابات کے اٹھ جانے سے حقیقت ابدی منکشف ہو جاتی ہے اور عارف ذات حق کی معرفت کے لئے قدم آگے بڑھاتا ہے تو اسے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں اور اس لاعلمی کا علم ہی اس کے لئے سب سے بڑا علم قرار پا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

؎ معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

بس بارگہ الوہیت میں یہی انسانی علم کی انتہا ہے کہ انسان کو اس کے ہونے اور

اپنے نہ ہونے کی خبر ہو جائے۔ غالب نکتہ دان نے اس مقام معرفت کو کیا خوب بیان کیا کہ

ے ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اکبر نے اسی حیرت و درماندگی اور تحیر و بے خبری کو منتہائے علم تصور کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ

ے ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بہت ہی عالم تھا

اس لئے اس ذات بلند و برتر نے اپنا نام اللہ منتخب فرمایا' تاکہ انسان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ وہ اس ہستی مطلق کی عظمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا اسی کو امام رازیؒ یوں بیان کرتے ہیں۔

فھھنا العجز عن درک الادراک ادراک۔ پس اس مقام پر حصول ادراک میں عجز و ناکامی کا نام ہی ادراک ہے۔

تیسرا مادہ اشتقاق۔ اله (سکون پانا):

اس بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ اِلٰهٌ اَلَهَ سے مشتاق ہے جس کا معنی سکون پانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ **الهت الی فلان ای سکنت الیه** (کہ میں نے فلاں سے سکون پایا) ذات باری تعالٰی کو اله اس لئے کہا جاتا ہے کہ بیتاب دلوں کو اسی سے تسکین ملتی ہے۔

قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ‎O
(الرعد، ۲۸:۱۳)

جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے ‎o

ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ‎O
(الانفال، ۲:۸)

ایمان والے تو صرف وہی لوگ ہیں کہ جب (انکے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل (اسکی عظمت و جلال کے تصور سے) خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب ان پر اسکی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (کلام محبوب کی لذت انگیز اور حلاوت آفریں باتیں) انکے ایمان میں زیادتی کر دیتی ہیں اور وہ (ہر حال میں) اپنے رب پر توکل (قائم) رکھتے ہیں۔

اس آیت میں اہل ایمان کی حالتِ محبت بیان کی جارہی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں جو اپنا رشتہ محبت اس محبوب حقیقی سے استوار کر لیتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ علامت محبت ہے کہ محبوب کا نام اور ذکر سن کر اہل محبت کے دلوں کو تسکین ملتی ہے۔ سب غم زیست بھول جاتے ہیں، دل اس کی یاد میں میں لذت وطمانیت اور کیف وسرور کی دولت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں لیکن سورۂ انفال کی مذکورہ بالا آیت میں ''و جلت قلوبھم'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جن میں دل کے لرز جانے کا ذکر ہے۔اہل دل سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ

جب محبت شدت اختیار کر کے عشق کا روپ دھار لے تو دل پر عجیب کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں' اس وارفتگی اور جنون کی حالت میں جب محبوب کا نام سننے میں آئے' کہیں اس کا تذکرہ ہو یا خود دل میں اس کی یاد زور پکڑ لے تو دل لرز لرز جاتا ہے' بعض اوقات کپکپی کی کیفیت طاری ہوتی ہے' یوں لگتا ہے جیسے جسم میں سے بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ عاشق اس کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے آنکھیں برسنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہی یاد اسے بے چین کر دیتی ہے اور یہی اس کے لئے باعث سکون بھی بنتی ہے۔ متنبّی محبوب کا ذکر سننے پر دل کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے۔

الیس و عدتنی یا قلب عنی   اذا ما تبت عن لیلی تتوب

فھا انا تائب عن حب لیلی   فما لک کلما ذکرت تذوب

(اے دل! کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب میں لیلیٰ کی محبت سے تائب ہو جاؤں گا تو تو بھی توبہ کر لے گا؟ پس دیکھ میں تو لیلیٰ کی محبت سے تائب ہو چکا ہوں' اب تجھے کیا ہوا ہے کہ جب بھی لیلی یاد آتی ہے یا اس کا ذکر ہوتا ہے تو تو پھر پگھلنا شروع کر دیتا ہے)۔

قرآن اہل ایمان کی اس حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جب باری تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو اہل ایمان کے دل پگھلنے لگتے ہیں' کیونکہ جوں جوں حب الٰہی عشق میں بدلتی جاتی ہے' ایمان کمال کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (البقرۃ' ۲:۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔

اسی ٹوٹ کر محبت کرنے کو ہی تو عشق کہتے ہیں اور اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے

کہ عاشق کو محبوب کے سوا نہ کسی اور کی طلب رہے اور نہ ضرورت۔ اسی بے نیازی کو قرآن ’’و علی ربھم یتوکلون‘‘ کے الفاظ سے تعبیر کر رہا ہے کہ اہل ایمان اپنے محبوب حقیقی کے علاوہ کسی اور کے لطف و کرم اور عنایت و احسان کی آرزو ہی نہیں کرتے۔ جب دنیا کی تمام متاع اور خیر کا منتہائے کمال سکون قلب ہی ہو اور یہ دولت انہیں دامن محبوب سے میسر آ جائے تو پھر انہیں کسی اور جانب نگاہ اٹھانے کی حاجت ہی کیوں ہو؟ کسی نے کیا خوب کہا ہے

؎ سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر

اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

چنانچہ لفظ الٰہ ذات باری تعالیٰ سے انسان کے محبت کرنے اور اسی سے سکون قلب پانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ پر الف لام کے واقع ہونے سے جو تعریف اور اختصاص پیدا ہو رہا ہے اس کی افادیت یہ ہے کہ انسان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے کہ اس عالم آب و گل میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی ہستی نہیں، جو اسے سکون کی حقیقی دولت سے بہرہ ور کر سکے۔ گویا یہ نام پریشان حال لوگوں اور بے چین و مضطرب دلوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنا رہا ہے کہ دنیا کی گوناگوں مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات اور دل و دماغ کی آسودگی و طمانیت دنیوی عیش و آرام کے سامانوں سے میسر نہیں آ سکتی، زیادہ سے زیادہ دولت اور مادی وسائل و ذرائع سمیٹنے سے نصیب نہیں ہو سکتی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی ہوس نفس پرستی کے تحت محکوم اور غلام بنا لینے سے نہیں مل سکتی۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے دامن لطف و عافیت سے وابستہ ہو کر ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ بیشک بیقرار دلوں کو اسی کی یاد میں قرار ملتا ہے اور غم حیات کے ستائے ہوئے انسانوں کو اسی سے لو لگانے میں سکون ملتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دنیا میں کتنے انسان ایسے ہیں جو تمام مالی

آسائشوں اور سامانِ عیش و طرب کی فراوانیوں کے باوجود سکونِ قلب سے محروم ہیں' اور اسی دولت کی تلاش میں رات دن سرگرداں ہیں۔ اسی بنا پر وہ آئے دن متعدد امراض کا شکار بھی ہوتے ہیں' لیکن اس کے برعکس وہ خوش نصیب جنہوں نے تمام مادی دولتوں کے عوض ایک روحانی دولت یادِالٰہی کی صورت میں پالی ہے' کس قدر مطمئن اور پرسکون رہتے ہیں۔ ''لاخوف علیهم ولا هم یحزنون'' کے مصداق ہر پریشانی سے محفوظ ہیں۔ یادِحق سے شغف و انہماک انہیں کتنی لذت' سکون' طمانیت اور کیف و سرور عطا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ تو اسی کو ہوسکتا ہے جس نے شب کی تاریکیوں میں محبوبِ حقیقی کی خاطر اپنا پہلو بستر سے جدا رکھا ہو' جس نے نصف شب اور آخر شب عشقِ الٰہی میں بسمل کی طرح تڑپنے کا مزہ چکھا ہو' جس نے راتوں کی خلوت کو محبوب کی یاد اور اس کے ذکر و فکر سے جلوت میں بدل کے دیکھا ہو' جس نے اسے منانے کے لئے رو رو کر اپنا دامن آنسوؤں سے بھگویا ہو اور جس نے عشق کی آگ کو سرد آہوں سے بجھانا سیکھا ہو' اسی کو اس سکون اور لذت کی خبر بھی ہوسکتی ہے اور قدر بھی۔ جس پر یہ کیفیات کبھی بیتی ہی نہ ہوں اسے ایسے احوال کی کیا خبر' یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص نہایت خوش ذائقہ پھل کھا کر اس کی وہ لذت اور شیرینی جو اسے کھانے میں محسوس ہوئی تھی ایسے شخص کو سمجھانے لگے جس نے کبھی وہ پھل چکھا تک نہ ہو' آخر یہ کیونکر ممکن ہوگا۔ وہ شخص یقیناً اس لذت کو سمجھنے سے قاصر ہوگا جب تک کہ وہ خود اس پھل کو نہ کھالے۔ لہٰذا اس سکون کو جو اللہ کی ذات سے لو لگانے میں میسر آتا ہے خود لو لگا کر محسوس تو کیا جاسکتا ہے' دلائل سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ اسی سکونِ قلب کے حصول کے لئے تو اہلِ دل شب بھر یادِحق میں مشغول رہتے ہیں۔

جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًاO

(الفرقان‘۲۵:۶۴)

اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیام میں راتیں بسر کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَO

(الذاریات‘۵۱:۱۸)

اور صبح کے وقتوں میں (اپنے رب سے) بخشش طلب کیا کرتے تھےo

اس آیت میں اہل محبت کی دائمی حالت یہ بیان کی جا رہی ہے کہ محبوب کو منانے کے لئے وہ ہمیشہ پچھلی رات آہ و بکا کرتے ہیں‘ اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں‘ اس کی یاد میں راتوں کی نینداور سحر کا خمار انگیز وقت قربان کرتے ہیں تب جا کر انہیں من کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے بجا کہا ہے۔

؎ عطار ہو‘ رومی ہو‘ رازی ہو‘ غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ وسحر گاہی

سکون قلب یا من کی دولت ایسی دولت ہے‘ جس پر نہ غربت اثر انداز ہوتی ہے نہ امارت‘ نہ سفر نہ حضر‘ نہ بیماری نہ صحت‘ نہ کمزوری نہ طاقت‘ اس سے باطن میں ایک الگ ہی دنیا آبادی ہوتی ہے جس کی ہماہمی میں انسان مگن رہتا ہے اور تمام دنیوی احوال اس کے لئے اضافی ہوتے ہیں اور اضافی کیفیات عاشق کی دنیا میں اپنا کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ اقبالؒ نے دونوں کا موازنہ کس حسن وخوبی سے کیا ہے۔

؎ تری دنیا جہان مرغ و ماہی　　مری دنیا فغاں صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور　　مری دنیا میں تیری پادشاہی

چوتھا مادہ اشتقاق۔ الولہ (عقل کا گم ہونا):

دوسرے اور چوتھے مادوں میں معنوی یکسانیت ہے۔ دوسرا مادہ اشتقاق الہ تھا۔ جس کا معنی تحیر و درماندگی بیان کیا گیا ہے اور ولہ میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان دونوں مادوں کے اعتبار سے لفظ الہ کا معنی وہ ذات ہے جس کی جستجو میں عقل و خرد گم ہو جائیں۔

عقل ہمیشہ سے اسی حقیقت ابدی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن آج تک بالیقین اسے پا نہ سکی۔ فلسفہ کا آغاز بھی اسی حقیقت یعنی منظور کو جاننے کی کوشش سے ہوا تھا۔ چنانچہ فلسفہ اپنے دور عقلیت میں حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ عقلیت کے علم بردار فلاسفہ یونان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ صرف عقل ہی ذریعہ علم حقیقت ہے۔ اس سے محسوسات کے حقیقت ہونے کا انکار لازم آیا اور حقیقت کو صرف معقولات سے مختص کر دیا گیا، لیکن جو ذات عقل کے حیطہ ادراک سے ماوراء تھی حقیقت قرار نہ پاسکی اور بالآخر فلاسفہ اس تصور علم سے تائب ہو گئے۔ اس کے بعد فلسفے کے دور حسّیت کا آغاز ہوا جس میں صرف حواس کو ہی ذریعہ علم حقیقت مانا گیا۔ اس طرح محسوسات حقیقت قرار پا گئے اور معقولات کے حقیقت ہونے کا انکار ہو گیا، لیکن جو وجود حواس کے حیطہ ادراک سے ماوراء تھا، حقیقت قرار نہ پا سکا۔ عقل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں اور پریشان پھرتی رہی اور بالآخر تشکیک اور سوفسطائیت کی نذر ہو گئی۔ فلاسفہ اور عقلاء کے پاس عقل کو اس بھنور سے نکالنے کی کوئی تدبیر نہ تھی اور نہ حقیقت کو پانے کا کوئی حتمی لائحہ عمل نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تلاش و جستجو کا رخ ہی بدل لیا۔ انہوں نے توجہ منظور (جسے دیکھا جا رہا ہو) کی بجائے ناظر (خود دیکھنے والے) کی طرف کر لی اور عقل کو بجائے ''اسے'' تلاش کرنے کے ''اپنی'' ہی تلاش میں مگن کر لیا۔ اس لئے فلاسفہ کے انداز فکر اور سمت جستجو میں یہ تبدیلی دراصل اس حقیقت کا

اعتراف تھا کہ ''عقل حقیقت ابدی کو نہیں پا سکتی'' عقل کے سفر میں اتنے مراحل اس لئے آئے کہ وہ اقدام وخطا (Trial and Error) کے طریق پر گامزن تھی۔ اگر وہ شروع سے آستان مذہب پر سر تسلیم خم کر لیتی تو اسے اتنے جتن نہ کرنے پڑتے' کیونکہ مذہب تو اس حقیقت کو اللہ کا نام دے کر پہلے دن سے یہ پکار رہا تھا کہ اس ذات کا ادراک حواس و عقل کی پرواز سے بلند ہے اگر عقل اس کی تلاش میں نکلے گی تو خود گم ہو جائے گی۔ عقل کو بالآخر اعلان الوہیت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اب عقل کا خود ناظر کی تلاش میں مصروف ہو جانا دراصل معرفت نفس کی سعی ہے اور یہ سعی ذریعہ وجدان کے بغیر ممکن نہیں۔ تلاش کے لئے دو ہی تو عالم تھے۔ عالم آفاق اور عالم انفس۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَ فِىٓ اَنْفُسِهِمْ۔	ہم جلد ہی کائنات میں اور ان کے نفوس میں انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔

(حم السجدہ' ۴۱' ۵۳)

عالم آفاق میں حواس اور عقل کی کاوشیں کارگر ہو سکتی تھیں۔ جدوجہد کے بعد انہیں حقیقت کا سراغ تو مل گیا' لیکن وہ اسے پا نہ سکیں مگر عالم انفس میں معرفت نفس کی کاوش میں حواس اور عقل سے کہیں زیادہ وجدان کی ضرورت ہے' اس نہج پر بھی حقیقت کا احاطہ تو ممکن نہیں' لیکن اس کی کچھ نہ کچھ معرفت ضرور حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ **من عرف نفسه فقد عرف ربه** کے الفظ سے ظاہر ہے۔

(۱۔ کشف الخفا' ۲:۳۴۳۔ ۲۔ مقاصد الحسنہ: ۴۱۹)

اقبال تلاش حقیقت کے لئے صحیح سمت کی نشاندہی اس طرح کرتا ہے

؎ کرا جوئی چرا در پیچ و تابی ۔۔۔ کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی ۔۔۔ تلاش خود کنی جز او نیابی

چنانچہ لفظ الٰہ جس واجب الوجود کی ذات والا صفات پر دلالت کرتا ہے اس کی براہ راست معرفت عقل انسانی کے بس میں نہیں، بلکہ یہ اس کے مظاہر کی معرفت سے ممکن ہے اور حقیقت انسانی خود اس ہستی مطلق کی سب سے کامل مظہر ہے اس لئے اقبالؒ ایک اور مقام پر اسی حقیقت کو آشکار کرتے ہیں۔

؎ اگر خواہی خدارا فاش بینی ۔۔۔ خودی را فاش تر دیدن بیاموز
اگر زیری زخود گیری زبر شو ۔۔۔ خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

اسی تصور کو ایک اور انداز میں یوں واضح کیا گیا ہے۔

؎ چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش ۔۔۔ زندگی مرگ است بے دیدار خویش
بر مقام خود رسیدن زندگی ست ۔۔۔ ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست

معرفت ذات حق کی راہ پانا عقل سے نہیں ذوق وجدان سے ممکن ہے

؎ اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

عقل تو خود ہی اس راہ میں دم بخود ہے اس حقیقت کی تلاش میں عقل مادی کا سہارا لینے والے بھی گم گشتہ راہ ہیں۔ عقل کی بے سروسامانی اور عشق کی شناسائی منزل راہ نوردوں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے

؎ بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری

پانچواں مادہ اشتقاق۔ لاۃ (بلندی وارتفاع)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ الٰہ کا مشتق منہ لاۃ ہے۔ جس کا معنی بلند ہونا ہے۔

چنانچہ اس لفظ کی معنوی دلالت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو ہر عجز و کمزوری سے بلند ہو جو ہر نقص اور حرمان سے بلند ہو جو ہر عیب و خطا سے بلند ہو جو ہر ضرورت و احتیاج سے بلند ہو جو ہر مناسبت و مماثلت سے بلند ہو جو ہر ایک کے کفر و شرک سے بلند ہو جو انسانوں کے ظلم و بربریت سے بلند ہو جو انسانی وہم و گمان سے بلند ہو ممکنات و محدثات سے بلند ہو جو ہر مخلوق کی قوت ادراک سے بلند ہو اور جو ہر ایک کی طاقت و توصیف سے بھی بلند ہو۔ اسی لئے ارشاد فرمایا گیا۔

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ O (الانعام ۶:۱۰۰)

وہ ان (تمام) باتوں سے پاک اور بلند و بالا ہے جو یہ (اس سے متعلق) کرتے پھرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا۔

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ O (الصفت ۳۷:۱۸۰)

آپ کا رب بڑی عظمت والا رب ان تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ (منکرین حق) بیان کرتے ہیں o

امام رازیؒ باری تعالیٰ کی مطلق بلندی و برتری کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

ان الواجب لذاته لیس الا هو، والکامل لذاته لیس الا هو، والاحد الحق فی هویته لیس الا هو، والموجد لکل ماسواه لیس الا هو (التفسیر الکبیر)

ارتفاع عام طور پر ایک اضافی امر تصور کیا جاتا ہے جس کا تعلق مکان سے ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات مکان اور اضافت مکانی سے بھی بلند و بالا ہے۔ اس لئے اس عالم کو جہاں اس کے انوار ذات کا جلوہ عیاں ہے اصطلاح میں عالم لامکاں کہتے ہیں۔

لامکاں کو عالم کہنا بھی جائز ہے ورنہ اس کی ذات اس سے بھی بلند ہے۔ کیونکہ اس کا ارشاد تو یہ ہے۔

انا مکون المکان و لیس لی مکان سوی الانسان

میں مکان کو پیدا کرنے والا ہوں سوائے انسان کے اور کوئی مکاں میرا نہیں ہے۔

(رسالہ غوث الاعظم)

اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا۔

ما وسعنی سمائی ولا ارضی ولکن و سعنی قلب عبدی المومن۔

مجھے زمین اور آسمان کی وسعتیں اپنے اندر نہیں سمو سکتیں لیکن میں اپنے بندۂ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں۔

(التذکرہ فی الاحادیث المشتہرۃ للزرکشی: ۱۳۵)

اس لئے وہ ذات بغیر مکان اور سمت و جہت کے ہر شے سے بلند و برتر ہے لیکن اس کی بلندی کائنات کی تمام جہتوں میں اس کے ظہور کو ہرگز مانع نہیں ہے بناء بریں ارشاد قرآنی ہے۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ (البقرۃ، ۲:۱۱۵)

پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے۔

چھٹا مادۂ اشتقاق۔ لاہ یلو (مخفی ہونا):

اس اعتبار سے الٰہ کا اطلاق اس ذات مقدس پر ہوتا ہے جو ہر آنکھ سے پنہاں ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے۔

هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ الۡبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمٌO
(الحدید۵۷:۳)

وہی اول ہے اور وہی آخر، وہی عیاں ہے اور وہی پنہاں اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہےo

گویا وہی ذات عیاں بھی ہے اور نہاں بھی، ظہور و احتجاب (اجاگر ہونا اور مخفی ہونا) دونوں شانوں کا بیک وقت ایک ہی ذات میں موجود اس طرح ممکن ہے کہ

۱۔ وہ جلوۂ حسن اپنی صفات کے اعتبار سے عیاں ہو مگر ذات کے اعتبار سے نہاں، گویا کائنات میں ہر سو اس کی صفات و کمالات ربوبیت کا جلوہ ظہور پذیر ہو۔ اس کی بے پایاں رحمتیں اور نشانیاں اظہر من الشّمس ہوں جو قدم قدم پر انسان کو اس کے ہونے کا یقین دلا رہی ہوں۔ لیکن جب انسان اس کی ذات کا بے حجاب دیدار کرنا چاہے تو وہ مستور و محجوب رہے، یعنی اس کی صفات ظاہر ہوں اور ذات باطن۔

۲۔ اجتماع ظہور و بطون کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ذات اس قدر ظاہر ہو کہ دکھائی نہ دے سکے، گویا وہ شدت ظہور کی بنا پر آنکھوں سے مخفی رہے۔ اس ضمن میں امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

قال بعض المحققين، فسبحان من اختفى عن العقول لشدة ظهوره، و احتجب عنها بكمال نوره۔
(التفسیر الکبیر، ۲۹:۱۲۵)

بعض محققین کہتے ہیں پاک ہے وہ ذات جو اپنی شدت ظہور کے باعث عقلوں سے محجوب ہے اور کمال نور کے باعث ان سے مخفی ہے۔

جیسے سخت گرمی کے موسم میں عین نصف النہار کے وقت سورج کو اس کی شدت ظہور کے سبب سے براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس طرح وہ عیاں ہو کر بھی نہاں رہتا

ہے۔ لیکن ظہور آفتاب کو اس نور حق کے ظہور تام سے کیا نسبت ہوسکتی ہے، جس کا بیان ''الله نور السموت والارض'' کے لفظوں میں کیا گیا ہو اور ''واشرقت الارض بنور ربھا'' کا اعلان جس کی جلوہ تابانیوں پر دلالت کرتا ہو چنانچہ وہ ذات اپنے نور ذاتی اور نور صفاتی کے ساتھ اس قدر ظاہر، عیاں اور تاباں ہے کہ کوئی آنکھ اس کے جلوے کی تاب نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ ظاہر ہو کر بھی مخفی رہتی ہے۔

۳۔ ذات باری کے مخفی ہونے کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ قابل ادراک نہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ درمیان میں مناسب فاصلہ ہو اگر ناظر و منظور دونوں میں اتنا قرب ہو کہ نقطہ بھر بھی فاصلہ اور دوری باقی نہ رہے تو منظور مخفی ہی رہتا ہے اسے دیکھا نہیں جا سکتا، جیسے پتلی آنکھ کے اندر ہو کر بھی آنکھ سے مخفی ہے، اسی طرح ذات حق انسان کے باطن میں سما کر بھی اس سے مخفی رہتی ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔

(البقرۃ، ۲:۱۸۲)

اور (اے حبیب) جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو (بتادیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں۔

ایک اور مقام پر اس قرب کی نوعیت یوں بیان کی گئی ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِO

(قٓ، ۵۰:۱۶)

اور ہم تو اسکی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اس آیت میں بھی قرب کو مبالغے کے صیغے سے بیان کیا گیا ہے، لیکن قرب کی حد متعین نہیں کی گئی جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ذات اپنے بندے سے اتنی قریب ہے

کہ اس کا اندازہ بھی ممکن نہیں۔ گویا ذات حق سارے جہان اور اہل جہان کی جان ہے اس لئے بدن اسے دیکھنے سے قاصر ہے۔ بقول شخصے

؎ حق جان جہان است و جہاں جملہ بدن
توحید ہمیں است و گر حیلہ و فن

حضرت رومیؒ جان وتن کے قرب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

؎ سر من از نالہ من دور نیست لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن زجان و جاں زتن مستور نیست لیک کس را وید جاں دستور نیست

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں۔

؎ محرم ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مرز بانرا مشتری چوں گوس نیست

حقیقت یہی ہے کہ قرب الٰہی کا یہ ہوش پوری دنیا و مافیہا سے بے ہوش ہوئے بغیر نصیب نہیں ہوسکتا۔

؎ چوں ایں جا بے خودی می آدرد ہوش
عبارت را اشارت گفت خاموش

۴۔ ذات حق کے ظاہر اور باطن ہونے کا معنی یہ بھی ہے کہ وہ ذات خود مخفی ہے لیکن ہر شے میں اپنی قدرت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ اس کی مثال روح کی سی ہے جو خود مخفی رہتی ہے لیکن اپنے تصرفات کو جسم کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ جسم درحقیقت مردہ و بے جان ہوتا ہے لیکن روح کا محکوم۔ لوگوں کی نظر میں جسم کی حرکات عیاں ہوتی ہیں اور وہ روح جو اصل محرک ہے نہاں ہوتی ہے۔ گویا روح کی حیثیت ''ہست نیست نما'' کی ہوتی ہے کہ خود حقیقت میں متصرف ہے لہذا ''ہست'' ہے اور حرکت جسم جو اصلاً نیست تھی روح کی وجہ

سے ہست نظر آنے لگی۔ اس طرح ''گرد باد'' میں ہوا اصل محرک ہوتی ہے لیکن خاکی ذرات تیز رفتاری کے ساتھ گول چکر میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا مخفی اور محجوب رہتی ہے اور ذرات ظاہر وعیاں' لوگوں کی نظریں ذرات کی حرکت پر پڑتی ہیں لیکن ہر ہر ذرے کے پیچھے کارفرما قوت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت ہست تو وہ صاف ہوا تھی جس نے تحریک کے ذریعے ذرات خاک کی حرکت کو نیست سے ہست بنا دیا۔اس طرح وہ قادر مطلق جو قیوم عالم ہے وہی ہست تھا' لیکن نیست نما تھا کہ جس نے اپنے تصرف سے موجودات عالم کو متحرک بنا دیا' وہ خود تو مخفی و باطن ہے لیکن اس کا تصرف وقدرت کائنات کے ذرے ذرے میں ظاہر ہے' ورنہ اس کے بغیر ہر چیز نیست ومعدوم تھی۔اس قرآنی ارشاد کا یہی معنی ہے ''کل شی ھالک الا وجھه''(سوائے اس کے ہر ہست نیست ہے) چونکہ ہر شے اسی کی ہستی سے قائم ہے اس لئے ارشاد فرمایا گیا ''وھو معکه اینما کنتم'' (تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے) لہذا الہ کا لفظ اس معنوں میں اس ذات کی مخفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ساتواں مادۂ اشتقاق ۔ الہ (جھکنا' راغب ہونا اور رجوع کرنا)

اس اعتبار سے الہ کا معنی ہوا وہ ذات جس کی طرف جھکا جائے اور رجوع کیا جائے چنانچہ وہی ہے جس کی طرف جھکنا' راغب ہونا اور رجوع کرنا فطری اور لابدی امر ہے۔ گویا الہ کے کلمات اس حقیقت کا کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ اے انسان تو چاہے جتنا سرکش و باغی بن جا' اپنے رب کی اطاعت وغلامی سے جتنا بھی منہ موڑ لے' اس کی ذات سے دل کا علاقہ جس قدر چاہے منقطع کرلے' لیکن جب بھی تجھ پر آفت ومصیبت کی گھڑی آئے گی' ساری دنیا کے اسباب وذرائع سے تو کلیتہً مایوس ہو جائے گا اور کسی چیز

پر بھی تجھے بھروسہ اور کوئی امید باقی نہ رہے گی تو اس وقت تیرا دل عاجزی اور شکستگی کے ساتھ بے اختیار ذات باری تعالیٰ کی طرف جھک جائے گا' تو اسے والہانہ رغبت اور رجوع کے ساتھ پکارے گا کہ اے اللہ مجھے بچالے اور میرے حال پر رحم فرما۔ تیرے لاشعور کی یہ دبی ہوئی آواز بلند ہو جائے گی جب سب امیدیں ٹوٹ جائیں اور صرف ایک ہی امید باقی رہ جائے تو وہ امید ''اللہ تعالیٰ'' کی ذات رحیم و کریم کی ہوتی ہے اس وقت ہر انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم' موحد ہو یا مشرک' مومن ہو یا کافر و ملحد بلا استثناء اسی ذات کو پکارتا ہے اور دل اس کے سوا کسی اور جانب جھکنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ طبعی و فطری حقیقت ہر صورت میں رونما ہو کر رہتی ہے۔ خواہ بندہ اسے کوئی بھی نام دیدے اس ہستی کو خدا کہے یا کوئی اور ماورائی طاقت' لیکن اس کا دل کسی عظیم ہستی کے تصور سے پسیجنا ضروری ہے' بس یہی ذات وحدہ لاشریک ہے اور اسی کا نام اللہ ہے۔

مزید براں جب الہ کے لفظ میں اس کی طرف راغب ہونے کا معنی موجود ہے تو اس کے بالمقابل انسان ہی سب سے زیادہ مستحق ہستی ہے جو اس کی طرف سب سے بڑھ کر راغب اور مانوس ہو۔ کیونکہ لفظ انسان بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے انسان کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انس سے ماخوذ ہے اور دوسرے یہ کہ نسیان سے۔ پہلے مادہ کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا مانوس ہونے والا' جب کہ دوسرے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا بھولنے والا۔ ان دونوں معنوں میں کوئی تضاد ہرگز نہیں اس لئے کہ انس سبب ہے اور نسیان اس کا نتیجہ' جب انسان کسی سے مانوس ہوتا ہے اور محبت کرنے لگتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ محبوب کے ماسوا کو بھولتا جاتا ہے' جب انس کمال کو پہنچتے ہیں تو وہ محبوب کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا ہے' یہاں تک کہ اسے اپنی بھی ہوش اور خبر باقی نہیں رہتی اور وہ ''ذاکر ہمہ ذکر و ذکر مذکور شود''

کا مصداق ہو جاتا ہے۔ گویا یہی نسیان اس کے انس کے کامل ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ اب ایک طرف اللہ جلوہ حسن کے طور پر موجود ہے اور دوسری طرف انسان اس کی جانب راغب اور مانوس ہونے کے لئے۔ چنانچہ وہ ذات جس کی طرف محبت کرنے والے دل جھکتے اور راغب ہوتے ہیں وہ ذات باری ہے اور جو افراد اس حسن ازل کی محبت میں گرفتار ہیں کامل انسان ہیں یہی پیغام محبت لفظ الٰہ کے ذریعے نوع انسان کو دیا جا رہا ہے کہ اے افراد نوع انسانی! زوال پذیر حسن کے جلوؤں سے دل لگانے کی بجائے اس لازوال حسن کے گرویدہ ہو جاؤ' اسی طرف لپکو اور اس کو منتہائے مقصود سمجھو' کیونکہ اس کی محبت میں جو موت آئے گی وہ حیات ابدی کا پیش خیمہ ہو گی۔

آٹھواں مادہ اشتقاق۔ الہ (عطا کرنا' پناہ دینا):

اس مادے کے اعتبار سے لفظ الٰہ اس معنی پر دلالت کرتا ہے کہ وہی وہ ذات ہے جو ہر ایک کو پناہ عطا کرنے والی ہے قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ۔ اور جو پناہ دیتا ہے اور جس کے خلاف (المومنون' ۲۳:۸۸) (کوئی) پناہ نہیں دی جا سکتی۔

انسان اپنی زندگی میں جتنی بھی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہیں' وہ فی الحقیقت انسان کا اپنا کسب نہیں ہیں۔ آنکھوں کی بصارت ہو یا کانوں کی سماعت' زبان کا ذائقہ ہو یا ہاتھ پاؤں کی حرکت' دماغ کی فکری قوت ہو یا طبعی و نفسیاتی لذت' الغرض حیات دنیوی کی تمام نعمتیں اگر اللہ تعالیٰ عطا نہ کریں تو پیدائش سے لے کر تادم مرگ انسان کسی وقت بھی ان کے حصول پر قادر نہیں ہو سکتا جب خود زندگی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دین ہے تو اس کے لوازمات و انعامات اس کی عطا کیوں نہ

ہوں؟

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ (النحل، ۱۶:۵۳)

اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے سو وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مظلوم اور مصیبت زدہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ سے بہتر نعمت اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (النساء، ۴:۷۸)

آپ فرما دیں (حقیقۃً) سب کچھ اللہ کی طرف سے (ہوتا) ہے۔

چنانچہ لفظ الٰہ کی معنوی افادیت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو سب کچھ عطا کرے، لیکن خود کچھ نہ لے۔ اسی لئے وہ خود کو الصمد (بے نیاز) کہتا ہے۔ یہاں یہ گمان نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے عبادت کا طلبگار ہے، نہیں نہیں عبادت اس کی احتیاج ہے اور نہ اجرت و معاوضہ، بلکہ چونکہ عبادت دراصل خشوع و خضوع، تذلل اور عاجزی و انکساری کی آخری صورت کا نام ہے۔ اس لئے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو سائل بننے کا سلیقہ سکھاتے ہیں تاکہ اس کی بارگاہ صمدیت سے کچھ مانگنے کا ڈھنگ آ جائے اور وہ ذات اپنے بندے کی عاجزی دیکھ کر اسے مزید لطف و کرم سے نوازے، اللہ تعالیٰ کا علی الاطلاق اجیر و معطی ہونا اس حدیث صحیح سے کتنا واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

انما انا قاسم و الله يعطى۔

بیشک تقسیم میں ہی کرتا ہوں لیکن عطا اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری، ۱:۱۶، ۳۱۔ کتاب العلم، ۱۳۔ باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، رقم: ۷۱)

گویا انبیاء کرام بھی روئے زمین پر باری تعالیٰ ہی کی نعمتوں اور عطاؤں کو تقسیم کرنے کے لئے تشریف لاتے ہیں۔

متذکرہ بالا تمام معانی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ذات باری تعالیٰ کی کامل دلالت کے لئے الہ سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں آ سکتا اس لئے اسے شہادت توحید میں استعمال کیا گیا۔

الہ کا نواں مرادی مفہوم:

الہ سے مراد وہ کلی طور پر با اختیار ہستی ہے جو **غالب الارادہ** ہے یعنی جس کے ارادہ ومنشاء کے سامنے ہر دوسرا ارادہ وعزم مغلوب ہو اور جس کے چاہنے سے ''وجود'' اور نہ چاہنے سے ''عدم'' عبارت ہو اس کی مشیت کے آگے کائنات ارض وسما کی ہر مخلوق برضا ورغبت یا بجبوری اپنی جبیں خم کر رہی ہو۔

ارشاد ربانی ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَھِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ○

(حم السجدہ ۴۱:۱۱)

اور پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی درآنحالیکہ وہ اس وقت دھواں تھا پس اس (آسمان) کو اور زمین کو حکم دیا کہ حاضر ہو جاؤ طوعاً وکرھاً دونوں نے عرض کیا ہم دست بستہ حاضر ہیں۔

اس آیہ کریمہ سے مترشح ہوا کہ اس حسین وجمیل اور منظّم ومربوط کائنات کا نظام رب العزت کے زبردست ارادے اور بلند پایہ عزم نے سنبھال رکھا ہے۔ یہ اسی کے حسن انتظام کا کرشمہ ہے کہ سورج اپنے مقام سے وقت مقررہ پر طلوع ہوتا ہے اور اپنی منازل

طے کرتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ چاند اپنی حیات افزوں کرنوں سے پھلوں میں لذت وحلاوت اور پھولوں میں نگہت ورنگ پیدا کرتا ہے۔ موسم بہار میں پھول کھلتے اور کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ ہوائیں بوجھل بادلوں کو اپنی کمر پر لاد کر دور دراز خطوں میں پہنچاتی رہتی ہیں۔ اگر بفرض محال اس کائنات میں رب العزت کی ذات کے سوا کوئی اور ہستی ارادے اور قدرت میں اس کے مساوی ہوتی تو نظام عالم کب کا درہم برہم ہوگیا ہوتا۔

ارشاد خداوندی ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔	اگر ان دونوں (زمین وآسمان) میں اللہ کے سوا اور (بھی) معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔
(الانبیا ۲۱: ۲۲)	

ایک زبردست متصرف الوجود اور غالب الارادہ ہستی جو اتنی بڑی اور وسیع و لامتناہی کائنات کے نظام کو بے مثال نظم وتوازن سے تنہا چلا رہی ہے' وہی الوہیت کی مستحق ہے۔ دو الٰہوں کا وجود عقل ومنطق کی رو سے بعید از فہم ہے۔ اگر برائے بحث تسلیم کرلیا جائے کہ کائنات میں دو الٰہ ہیں اور دونوں غالب الارادہ ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مغلوب الارادہ اور مفتوح نہیں ہے تو دو ممکنہ صورتیں ہوں گی پہلی صورت میں بفرض محال ایک شخص پر ان دو مختلف الٰہوں کے ارادے کام کر رہے ہوں جن میں سے ہر ایک کی صلاحیتیں اور قدرتیں دوسرے کے مساوی ہوں۔ اگر ایک الٰہ چاہے کہ یہ شخص بیمار ہو جائے اور دوسرے کی خواہش ہو کہ وہ صحتمند رہے' یعنی ایک غالب الارادہ الٰہ اسے بیمار کرنے اور دوسرا اس کی استمرار صحت مندی پر مصر ہو۔ اس صورت حال میں کون سی حالت برقرار رہ سکتی ہے۔ لامحالہ ان متضاد ارادوں کے نفاذ کی کشمکش میں مذکورہ شخص اپنے وجود ہی

سے اس طرح ہاتھ دھو بیٹھے گا جس طرح دو برابر قوتوں کے مابین معرکہ آرائی میں میدان جنگ بننے والا علاقہ مکمل طور پر تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یا تو وہ شخص بیمار پڑ جائے گا یا صحتمند رہے گا۔ اندریں صورت لامحالہ ایک الٰہ کا ارادہ غالب ہوگا اور دوسرے کا مغلوب' اب وہ ہستی جس کا ارادہ مغلوب ہوگیا اور وہ اس شخص پر اپنا ارادہ نافذ نہ کر سکی کبھی الٰہ نہیں ہو سکتی لہذا عقلاً کائنات ارض و سما میں ایک الٰہ برحق کے سوا کسی اور ہستی کی طرف نسبت الوہیت قائم کرنا محال ہے۔

اس امر کی مزید توضیح ایک اور مثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے کہ فرض کیجیئے ایک شخص موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو۔ ایک الٰہ اس شخص کو موت سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے' اور دوسرا اسے زندہ رکھنے پر مصر ہے۔ اب یا تو وہ شخص زندہ رہے گا یا پھر مر جائے گا۔ اگر وہ شخص زندہ رہا تو اس کی موت پر مصر الٰہ کا ارادہ نافذ العمل نہ ہو سکا اور اگر وہ مر گیا تو اسے زندہ دیکھنے والے الٰہ کا ارادہ مغلوب رہا۔ حالانکہ الٰہ تو ہوتا ہی وہ ہے جس کا ارادہ مغلوبیت اور ناکامی کے تصور سے بھی ناآشنا ہو اور بہر صورت نافذ ہو کے رہے۔

ان مثالوں کے بیان کرنے کا مقصود یہ نکتہ ذہن نشین کرنا ہے کہ کائنات میں دو الہوں کا تصور بھی عقل و منطق کی رو سے ناممکنات میں سے ہے۔ چہ جائیکہ دو سے زیادہ تعداد میں الٰہ کا وجود تسلیم کر لیا جائے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ان کے ارادے ہمیشہ باہم متفق ہی ہوں' لازماً کبھی نہ کبھی ان میں اختلاف و تفاوت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ اس صورت میں اختلاف صرف اسی طرح رفع ہو سکتا ہے کہ ایک الٰہ اپنے ارادے کو غلط' باطل یا مغلوب سمجھتے ہوئے دوسرے الٰہ کے ارادے کے نفاذ کو قبول کر لے اور خود اپنے ارادے

کے نفاذ سے دستبردار ہو جائے۔ اب جس کا ارادہ نافذ ہو گیا وہ تو صاحب قدرت اور غالب الارادہ الٰہ قرار پایا اور جس کا ارادہ نفاذ کے اعتبار سے تشنہ رہا وہ مغلوب الارادہ ہو گیا اور کوئی الٰہ مغلوب الارادہ نہیں ہوسکتا' لہٰذا تعدد الوہیت کا تصور عقلاً و نقلا بعید از فہم اور ناقابل التفات ہے۔

اسی بنا پر قرآن حکیم میں توحید باری تعالیٰ کی سب سے بڑی دلیل یہی قرار پائی اور نظام عالم میں نظم و قاعدہ اور توازن کی کارفرمائی اور اتنی بڑی کائنات کی حرکت پذیری میں کجی و ناہمواری کا فقدان پکار پکار کر شہادت فراہم کر رہا ہے کہ ایک ہی کامل اور اکمل ذات الوہیت کی سزاوار حقدار ہے۔ اور اگر بالفرض خدا کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہوتا تو پھر کائنات نظام عدل پر استوار رہنے کی بجائے آماجگاہ فتنہ وفساد بن جاتی اور پھر یہاں زمین ہوتی نہ زمینی مخلوق آسمان ہوتا نہ سیارگان فلک کی گردش اور چمک دمک۔

الٰہ کے جملہ مفاہم کا مجموعی تاثر:

متذکرہ بالا مفاہیم الوہیت پر علمی مباحث کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ کائنات ارضی و سماوی میں صرف وہی ایک ہستی الٰہ ہونے کی سزاوار اور مستحق ہے' جس کے فہم و ادراک سے عقل انسانی قاصر ہو اور سوچ کو ماسوائے تحیر و درماندگی کے کچھ ہاتھ نہ آئے اور جس کی جستجو میں عقل و خرد گم ہو جائیں' لیکن بلندی' عروج اور ماورائیت سے متصف ہونے کے باوجود وہ انسانیت کے دکھوں کا مداوا و درماں باعث تسکین قلب وجاں اور متلاشیان حق کے لئے ہر آن سکون و طمانیت اور حقیقی راحت کا سامان ہو' وہ ذات غالب الارادہ اور متصرف الوجود ہو۔ عطا کرنے والی اور سب کے دامن مراد کو مالا مال کرنے والی ذات کے آگے سب مخلوق اپنی جبیں عبودیت خم کر دے۔

لفظ اللہ کا مفہوم:

لفظ الٰہ پر الف لام داخل کرنے سے لفظ اللہ بن جاتا ہے جس کا مطلب ہے سچا اور حقیقی معبود۔ اب یہ لفظ بالتخصیص رب العزت کی ذات کے لئے وقف اور مخصوص ہو کر رہ گیا ہے اور اس طرح لفظ اللہ میں معنوی وسعت اور ہمہ گیری کی بنا پر الٰہ کے مندرجہ بالا تمام مفاہیم شامل ہو گئے ہیں۔

شہادت توحید کا مفہوم:

اس اعتبار سے شہادت توحید کا مفہوم یہ قرار پاتا ہے کہ بندہ دل کی گہرائیوں سے یہ شہادت دے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی ہستی ایسی ہے جس سے بڑھ کر کسی کی عظمت و رفعت اور شان کبریائی کا تصور بھی محال ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی کو قدرت و طاقت حاصل نہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی علیم وخبیر نہیں۔ اس کے سوا کوئی سزاوار پرستش نہیں اور اس کا ارادہ اتنا قوی اور غالب ہے کہ اسے تمام دنیا اور کائنات میں سب مل کر بھی مغلوب نہیں کر سکتے اس کی قدرتیں اور تصرفات حدود و قیود سے باہر اور حیطہ شمار سے ماوراء ہیں۔

لفظ اللہ کا ہر حرف معنوی دلالت میں کامل ہے:

بطور اسم ذات' لفظ اللہ جن حکمتوں کا حامل ہے ان مین ایک حکمت اس کی لفظی ترکیب میں مضمر ہے یہ لفظ اس نادر خوبی کا مالک ہے کہ اگر اس میں سے کوئی حرف حذف کر دیا جائے تب بھی بقیہ حروف معنوی اعتبار سے ذات باری تعالیٰ پر ہی بتمام وکمال دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ کا پہلا حرف ''الف'' حذف کر دیا جائے تو للہ رہ جاتا ہے جس کا معنی ہے'' اللہ کے لئے'' اب پہلا حرف رہنے دیں اور دوسرے حرف'' لام'' گرا دیں تو الہ رہ جائے گا جو معبود کے معنوں میں مستعمل ہے ۔ پہلے دونوں حروف الف اور لام حذف کر دیں تو لہ رہ جائے گا جس کے معنی اس کے لئے آتے ہیں۔ اللہ کے پہلے تین حروف الف لام لام حذف کر دیئے جائیں ''ہ'' باقی رہ جائے گا جو باری تعالیٰ کے اسم ذاتی کی نشاندہی کرتا ہے اور ھو (وہ) کے معنوں میں بطور ضمیر بھی بولا جاتا ہے۔ اہل اللہ اکثر اس کا ذکر بالجہر کرتے ہیں۔ الغرض اپنی ترکیب لفظی میں اللہ جزوی اور کلی طور پر ذات حق پر دال ہے اور

اس کا کوئی حرف بے معنی نہیں کوئی اسم اپنے مسمی پر دلالت کرنے میں اس سے زیادہ کامل تصور پیش نہیں کرسکتا۔

واجب الوجود ہستی:

قدیم فلاسفہ وحکماء کے نزدیک یہ کائنات دوحصوں میں منقسم ہے۔

۱۔ ممکن الوجود

۲۔ واجب الوجود

ممکن الوجود کے زمرے میں وہ سب وجود اور چیزیں شامل ہیں جن کا ہست ونیست ہونا اور موجود و معدوم ہونا دونوں جائز اور روا ہو اور ان کے وجود پر کائنات کے وجود کا انحصار نہ ہو۔ گویا دوسرے لفظوں میں ان کا وجود اور عدم وجود برابر و یکساں ہو۔ اگر ان مختلف النوع اشیاء کا کائنات میں وجود مان لیا جائے تب بھی درست ہے اور نہ مانا جائے تب بھی درست و جائز ہے۔ اس میں ذات باری تعالٰی کے سوا کائنات کی ہر چیز شامل ہے جبکہ اس کے برعکس واجب الوجود ہستی سے وہ ذات مراد ہے جس کے وجود پر کائنات کے وجود کا انحصار ہو اور اس کا ہر آن، ہر زمانے اور ہر کیفیت میں ہونا بہرحال ضروری ہو۔ اس کے عدم وجود کا تصور بھی ناممکن و محال ہو۔ اس بنا پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز واجب ہے تو اس کا معنی لامحالہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ہونا لازمی ہے اور نہ ہونے کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ اس کا اطلاق صرف اورصرف باری تعالٰی کی ذات مطلق پر ہوتا ہے کہ تنہا وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ازل سے موجود ہے اور ابدالاباد تک قائم و دائم رہے گی اور اسی کے وجود پر تمام کائنات کا دار و مدار ہے۔ وہی حی و قدیم ذات ہے جس نے کائنات رنگ و بو کو خلعت وجود عطا کیا اور اس کے ایک ادنٰی اشارے سے کارخانہ

ہستی کا نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔ پس ایک واجب الوجود ذات کا بلند و بالا اور برتر و اعلیٰ ہونا لازمی اور ضروری ہوتا ہے جبکہ ممکن الوجود کا پست و ادنی اور ہرلحظہ معرض فنا و ہلاکت اور انہدام کی زد میں ہونا ایک امر واقعہ کی طرح ناگزیر ہوتا ہے۔

اسی لئے ارشاد فرمایا گیا۔

۱۔كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَO (القصص ۲۸:۸۸)	ہر شے اللہ کی ذات کے سوا فانی ہے اسی کا حکم (ہر جگہ کارفرما) ہے اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔

پھر فرمایا۔

۲۔كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِO (الرحمٰن ۵۵:۲۶-۲۷)	جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات بابرکات صاحب جلال و عظمت ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

۳۔فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ (البقرۃ ۲:۱۱۵)	پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے۔

دلائل توحید:

مسئلہ توحید جو ماسوا اللہ کے وجود کی نفی اور ذات باری تعالیٰ کے اثبات کے مضمون پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے بنیادی اور اساسی موضوعات میں سے ہے۔ اس مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے متعدد دلائل و براہین قاطعہ جو قرآن حکیم سے مستنبط ہیں، انہیں بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔توحید کے نظری دلائل

۲۔توحید کے مشاہداتی دلائل

۱۔توحید کے نظری دلائل:

قرآن حکیم نے نظری استدلال کا انداز و اسلوب اختیار کرتے ہوئے اثبات توحید کے باب میں متعدد مقامات پر جو ارشاد فرمایا ہے یہاں اس کا محاکمہ مقصود ہے۔

پہلی دلیل:

تصور توحید کو انتہائی مثبت اور اچھوتے انداز میں قرآن حکیم یوں پیش کرتا ہے۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُO (البقرۃ، ۲:۱۶۲)	اور تمہارا معبود خدائے واحد ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہ) نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہےO

ابتدائے آفرینش سے انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ توہماتی طور پر ہر اس وجود کو منصب الوہیت پر فائز کر کے اس کی بندگی اور پرستش کا خوگر بنا رہا، جس سے اس کی ذات کے لئے مادی منفعت کا کوئی پہلو نکلتا نظر آتا تھا، ایک نادیدہ خدا کا تصور اس کے لئے عجیب وغریب بات تھی۔ بقول اقبال

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
ماننا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

اب اس کائنات رنگ و بو میں خدا کی ربوبیت نے جتنے بھی اسباب مہیا فرمائے اور مظاہر قدرت پیدا کئے ہیں وہ سب کسی نہ کسی طرح انسان کی خدمت بجا

لانے اور اس کے لئے منفعت اندوزی کا سامان مہیا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔انسان نے اپنی اس ازلی اورفطری کمزوری کی بنا پرعناصرِاربعہ آگ' پانی' مٹی اور ہوا اوران کے متعلقات کو جن سے وہ کسی نہ کسی صورت میں تمتع حاصل کرتا رہا' مقام الوہیت پر لا بٹھایا اوراپنی نادانی وکوتاہ نظری سے انہیں خدا یا خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تصور کرتا رہا۔متذکرہ بالا آیہ کریمہ میں اس باطل تصور کی نفی کرتے ہوئے انسان پر یہ حقیقت واشگاف کی جارہی ہے کہ وہ ذات جو نفع رساں اور مسلسل اپنی بے پایاں رحمت عموی کے خزانے نچھاور کرنے والی ہے ہی' منصب الوہیت کی سزاوار اور اس لائق ہے کہ جبینِ نیاز اسی کے سامنے جھکائی جائے۔ وہی لازوال ہستی جو تمہارے معاش کی حاجتوں کو پورا کرنے والی اور معاد کی ضرورتوں کو بھی فراہم کرنے والی ہےاس بات کی مستحق ہے کہ تم اپنا سرِتسلیم اورجبیں بندگی اسی کے سامنے خم کرو اورسبھی معبودان باطلہ کی پرستش و بندگی سے باز آجاؤ۔

دوسری دلیل :

قرآن حکیم ایک اورمقام پر اسی عقلی ونظری استدلال کو بروئے کار لاتے ہوئے انسان کو تخلیق کائنات اور اختلاف لیل ونہار کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَO	بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کی گردش میں(ان میں)عقلمندوں کے لئے (قدرت الٰہی کی بہت سی) نشانیاں ہیںo
(البقرۃ' ۲:۱٦۴)	

انسان کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی طرف مبذول کرائی جارہی ہے کہ یہ

کائنات ارضی و سماوی تو خود مخلوق ہے لہٰذا یہ الٰہ کیسے ہوسکتی ہے۔ منصب الوہیت پر فائز ہونے کی حقدار تو وہی ذات ہوسکتی ہے جو پیدا نہ کی گئی ہو' اس لئے کہ پیدا کی جانے والی ذات حادث تصور ہوگی اور حادث ذات کبھی الٰہ نہیں ہوسکتی۔ یہ بسیط و بیکراں ارضی و سماوی کائنات محیط ہے اور جو کچھ اس میں ہے محاط ہے۔ محیط ''کل'' ہے اور محاط ''جزو'' ہے اور دونوں میں قدر مشترک ان کا مخلوق ہونا ہے جب ''کل'' کو الوہیت کا سزاوار نہیں گردانا جا سکتا تو جزو کو الوہیت کا حقدار و سزاوار کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔

تیسری دلیل :

قرآن مجید میں ایک مقام پر اللہ رب العزت نے اپنی خالقیت و ربوبیت کو اپنی الوہیت و معبودیت کی عقلی دلیل کے پور پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ O الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ O

(البقرۃ' ۲: ۲۱۔۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کی (بھی) جو تم سے پیشتر تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمانوں کی طرف سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے تمہارے کھانے کے لئے (انواع واقسام) پھل پیدا کئے پس تم اللہ کیلئے شریک نہ ٹھہراؤ حالانکہ تم (حقیقت حال) جانتے ہو۔

اس آیہ کریمہ میں ''والذین من قبلکم'' تک باری تعالیٰ نے اپنی خالقیت اور ربوبیت کا ذکر کر کے اس بات کی شہادت دی ہے کہ آسمانی اور زمینی کائنات میں بس اسی کی ذات معبود ہونے کے لائق ہے اور اسی نے ہر شے کو پردۂ کتم سے باہر نکال کر خلعت وجود بخشا ہے اور ہر ایک کے لئے مادی و جسمانی ضرورتوں کا سامان فراہم کیا ہے۔

یہاں گویا مقصود اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام گزشتہ اور آئندہ نسلوں اور انسانیت کے تمام طبقوں کو معرض وجود میں لانے والی اور ان کی ضروریات کی کفالت کرنے والی واحد ہستی ہی اس امر کی مستحق ہے کہ اس کے سامنے سرِ بندگی اور جبینِ نیاز خم کی جائے۔ اس انداز استدلال سے اس بات کا استشہاد کیا گیا ہے کہ جب سب کو پیدا کرنے والی اور پرورش و تربیت کرنے والی ذات رب ذوالجلال کی ہی ہے تو انسان کس بر وجہ سے معبودان باطلہ کو اس کے ساتھ عبادت میں شریک کرتا ہے۔ گویا خالقیت و ربوبیت میں یکتا و واحد ہونا اس کی الوہیت و معبودیت میں یکتا و واحد ہونے پر محکم دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بات عقلِ سلیم کے خلاف ہے کہ انسان کو پردۂ نیستی سے وجود میں لانے والی اور اس کی تمام فطری و جبلی ضرورتوں کی تکمیل و تسکین کا سامان فراہم کرنے والی تو اس کی ذات ہو اور وہ عبادت کسی اور کی کرتا پھرے۔ جب وہ اولین و آخرین سب کا خالق و مالک اور پروردگار ہے تو اسے چھوڑ کر کسی مخلوق کی عبادت کرنا یا اللہ کی عبادت کے ساتھ اس کو شریک کر لینا عقل و فہم کی رو سے کب جائز اور روا ہوگا۔

توحید کے مشاہداتی دلائل:

خدا کی ہستی اور اثبات توحید پر قرآن حکیم کا طرز و اسلوب استدلال اس

ہمہ گیر ربوبیت کے نظام میں تعقل و تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے جو اس کائنات بسیط میں ایک خاص نظم و قانون منسلک ترتیب و قاعدے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن جا بجا انسان کو عالم انفس، آفاق میں تدبر کی دعوت دیتا ہے اور اس سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی اور اس کائنات کی خلقت پر غور وفکر کرے اور دیکھے کہ یہ کارخانہ حیات کس نظم و انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسان اگر غور کرے تو خود اپنی پیدائش اور عالم گرد و پیش کے مشاہدات اس پر عرفان ذات اور معرفت توحید باری تعالیٰ کے بہت سے سربستہ راز وا کر دیں گے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم نے جن دلائل سے ذات باری تعالیٰ کی توحید پر استشہاد کیا ہے ان میں سے چند کا اجمالی تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پہلی دلیل :

اگر گوش اور دیدۂ بینا کو وا کر کے ہم کائنات کی کھلی کتاب کا مطالعہ کریں تو اس کے ورق ورق سے ایک پروردگار کے وجود کا اعلان ہوتا دکھائی دے گا۔ اس کے اندر سے یہ پکار سنائی دے گی کہ اس کائنات کی تخلیق بالحق ہوئی ہے۔ انسان بے ساختہ اس بات کے اقرار پر مجبور ہو گا کہ

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ (آل عمران، ۳:۱۹۱)

اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا۔

اگر انسان مقصد و غایت تخلیق عالم ارضی و سماوی میں تفکر کرنے لگے تو اس کے وجدان میں یہ غیبی صدا آئے گی۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا لَعِبِيْنَO

(الدخان، ۴۴:۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اسکو جو ان کے درمیان ہے محض تفریح طبع کے لئے نہیں بنایاo

یہاں تخلیق بالباطل کی نفی کرتے ہوئے اسے لہو و لعب سے تعبیر کیا ہے یعنی اس کائنات کی کوئی شے بے غرض و بے مدعا پیدا نہیں کی گئی۔

دوسری دلیل:

قرآن اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان کائنات میں کارفرما نظامِ ربوبیت کا بے لاگ مطالعہ کرنے بیٹھے اور اس کے وجدان میں ایک رب العالمین ہستی کے ہونے کا یقین انگڑائیاں نہ لینے لگے۔ یہ ممکن ہے کہ انسان سرکشی، تمرّد اور غفلت کی بنا پر ہر چیز سے انکار کر دے، لیکن وہ اپنی فطرت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس کی فطرتِ سلیمہ کے خمیر میں خدا پرستی کا جذبہ خوابیدہ حالت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جب اس کی غفلت کا پردہ چاک ہوتا ہے تو اس کا وجدان خود اس کی رہنمائی کر کے اسے اس کے مدعا و منتہیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم اس حقیقت کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتا ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌO وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗO

(القیمۃ، ۷۵:۱۴۔۱۵)

بلکہ انسان خود بھی اپنی حالت پر مطلع ہوگا اگرچہ (اس وقت بھی) وہ اپنے حیلے (بہانے) پیش کرے گاo

وہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر خود اس کے باطن سے جواب طلب کرتا ہے۔

وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ۔

(یونس، ۱۰:۳۱)

اور زندہ کو مردہ (یعنی جاندار کو بے جان) سے کون نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ (یعنی بے جان کو جاندار) سے کون نکالتا ہے اور (نظام ہائے کائنات کی) تدبیر کون فرماتا ہے؟

تیسری دلیل :

قرآن حکیم میں ایسے مقامات جن میں ایک وسیع البنیاد (Broad Based) نظام ربوبیت سے توحید باری تعالیٰ پر استدلال کیا گیا ہے، بے شمار ہیں۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف چند ارشادات پر اکتفا کیا جائے گا۔

انسان سے مخاطب ہو کر آیات فرمایا گیا۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ O اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا O فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا O

(عبس، ۸۰:۲۴۔۲۷)

پس انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کی طرف غور کرےo بے شک ہم ہی نے خوب پانی برسایا پھر ہم نے زمین کو جابجا پھاڑ دیا o پھر ہم نے اسی میں غلہ پیدا فرمایاo

یہاں ”فلینظر الانسان“ کے ابتدائی کلمات ہی انتہائی فکر انگیز اور بصیرت افزا ہیں۔ انسان ہر چیز سے غافل ہو سکتا ہے لیکن وہ اپنی خوراک کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیر سکتا ۔ وہ دانہ گندم پر بیج سے پودا بننے کے نامیاتی عمل پر غور کرے تو نظام کائنات کے باطن میں جھلکنے والی ربوبیت اسے اس کارخانہ حیات کے پیدا کرنے والی ہستی کا سراغ دے گی۔

سورہ نحل میں خدا کے کارخانہ ربوبیت کی مثال شہد کی مکھی سے انتہائی بلیغ پیرائے میں دی گئی ہے ارشاد ربانی ہے۔

وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَO (النمل، ۱۶:۶۸)	اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں (خیال) ڈال دیا کہ تو بعض پہاڑوں میں اپنے گھر بنا اور بعض درختوں میں اور بعض چھپروں میں (بھی) جنہیں لوگ (چھت کی طرح) اونچا بناتے ہیں۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جسے پرورش کی احتیاج نہ ہو جس طرح ہر چیز جو مخلوق ہے اپنے خالق پر دلالت کرتی ہے۔ ایسی ہر چیز جو مربوب ہے اس کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہو۔

رحم مادر میں پرورش پانے والے جنین (Foetus) کو غذا پہنچانے کے پیچیدہ نظام کے مطالعہ سے نظام ربوبیت کی وہ کرشمہ سازیاں عیاں ہوتی ہیں جو کسی پرورش کرنے والی ہستی کی خبر دیتی ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہر ایک کو پرورش مل رہی ہو اور پرورش کرنے والی کوئی ذات موجود نہ ہو۔ تخلیق موجود ہو اور کوئی متصرف الوجود ہستی اس کی خالق نہ ہو۔ خود بخود تخلیق (Spontaneous Creation) کے تصور کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں اور اس کی لغویت (Absurdity) اتنی آشکارا ہے کہ غیر جانبدارانہ تعقل و تفکر سے انسان خدا کے وجود کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اثبات توحید کے خاموش دلائل:

کائنات ہست و بود کے نظام میں حرکت پذیر تمام اجرام ارضی و سماوی

اثبات توحید پر خاموش دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ زمین' یہ چاند' سورج' ستارے' شجر و حجر' بادل' لہلہاتے کھیت' مترنم آبشاریں' فلک بوس پہاڑ' سمندر کی لہروں کا تموج سب اگرچہ قوت گویائی نہیں رکھتے' لیکن زبانِ حال سے توحید کی دلالت کرتے اور اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ اس متوازن اور نظم و ضبط کے تحت چلنے والے کائناتی نظام کے پیچھے ایک ہی ہستی کا دست قدرت کارفرما ہے' جو ربوبیت اُلوہیت کی سزاوار ہے اور ارض و سمٰوٰت کی جملہ مخلوقات کی عبادت کے لائق ہے۔ لیکن کائنات میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جسے ''**برھان من ربکم**'' نے عنوان سے معنون کیا گیا ہے اور جو الوہیت خداوندی پر ناطق دلیل ہے وہ ہے ذات مصطفوی ﷺ ۔ پھر جو خدا مخلوق میں ذات مصطفوی ﷺ جیسی بے نظیر اور بے مثل ہستی پیدا کرسکتا ہے کوئی خود اس کا مثل اور عدیل کیسے ہوسکتا ہے۔ ذات باری کے وجود اور اثبات توحید پر وجود مصطفوی ﷺ ایسی ناطق دلیل ہے کہ جس کی توجہات سے خاموش دلیلیں بھی ناطق دلیلوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں' مثلاً چاند توحید ذات باری تعالیٰ پر خاموش دلیل تھا' اشارہ انگشت مصطفوی ﷺ سے دو نیم ہوکر ناطق دلیل بن گیا۔ سورج اثبات توحید پر ساکت دلیل تھا' اشارہ مصطفوی ﷺ سے غروب ہوتے ہوئے واپس پلٹ آیا اور دلیل ناطق بن گیا۔ ابوجہل کی مٹھی میں کنکریاں توحید باری کی خاموش دلیل تھیں' توجہ مصطفوی ﷺ سے ذکر کناں ہوکر ناطق دلیل بن گئیں۔ یہی نگاہ مصطفوی ﷺ تھی کہ جس طرف اٹھی خاموش و ساکت دلائل کو ناطق بنا کر رکھ دیا اور اپنی نسبت ''برھان من ربکم'' کا حق متحقق کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ جو شخص توحید خداوندی پر موجود خاموش دلائل کو مان کر خدا کی ہستی پر ایمان لاتا ہے اور اپنی عقل و فہم سے اس کی معرفت کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے جادۂ حق سے بھٹک جانے کا امکان و احتمال ہے' کیونکہ یہ دلائل نشان

راہ تو ہیں چراغ منزل نہیں ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ شخص جس نے اس واحد دلیل ناطق کو مان کر ذات باری تعالیٰ کی الوہیت و وحدانیت کا اقرار کیا خود اثبات توحید پر ناطق دلیل بن گیا اور ہمیشہ کے لئے امکان ضلالت و گمراہی سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ اس لئے کہ واسطہ مصطفوی ﷺ سے توحید باری تک رسائی اس تیقن کو پیدا کر دیتی ہے جس کے بعد ریب وتشکیک کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور خدا کا تصور انسان کے وجدان میں شامل ہو کر اس کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔

اثبات پر نفی کو مقدم کرنے کی حکمت:

الٰہ کا مفہوم اور حقیقتِ توحید واضح کرنے کے بعد یہ امر غور طلب ہے کہ کلمہ طیبہ میں اثبات سے پہلے نفی کو کیوں لایا گیا ہے۔ اثبات کو مقدم اور نفی کو موخر بھی تو کیا جاسکتا تھا مگر ایسا کیوں نہیں کیا گیا جان لینا چاہیئے کہ یہ امر خالی از حکمت نہیں' فی الحقیقت کلمہ طیبہ میں نفی کی تقدیم اس بات کا اعلان ہے کہ جب تک قلبِ سلیم ماسو اللہ کی کامل نفی نہیں کرتا اور اس سے نفع ونقصان کی تمام تر امیدیں منقطع نہیں کر لیتا۔ اس وقت تک کلمہ مبارکہ میں مضمر تصور توحید کے اثباتی اثرات قلب پر مترتب نہیں ہو سکتے۔ لہذا اگر کوئی شخص چشمہ عبودیت سے اپنی سیرت و کردار کو سیراب اور نور ایمان سے قلب و باطن کو منور کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے تمام معبودان باطلہ کا انکار کرے اور بارگہ الوہیت میں اپنی جبیں نیاز جھکا دے۔ اگر وہ اپنے باطن میں معبودان باطلہ کو جگہ دیئے ہوئے ہو اور اس نے اپنے نہاں خانہ دل میں طرح طرح کے بت سجا رکھے ہوں تو زبان سے کلمہ طیبہ کا ورد الاپتے رہنا چہ معنی وارد' اس کے دعوی ایمان کو سوائے منافقت کے اور کس چیز پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بندے کا دل ماسو اللہ کے خوف سے آشنا ہو تو خدا کی الوہیت کو

ماننے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے پہلے لوح قلب کو ہر باطل کی محبت اور خوف سے پاک اور صاف کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک دل' باطل کی محبت اور خوف سے آزاد نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر انوار الٰہیہ کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ انسان کا دل ہر جھوٹی محبت اور جھوٹے خوف سے بے نیاز ہو کر ہی مورد الطاف الٰہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ایمان صرف قبول حق ہی کا نام نہیں بلکہ ماسو اللہ کی نفی سے بھی عبارت ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی لَاانۡفِصَامَ لَهَا۔	سو جو کوئی معبودان باطل کا انکار کر دے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے ایک ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کے لئے ٹوٹنا (ممکن) نہیں۔
(البقرۃ' ۲:۲۵۶)	

کلمہ طیبہ اسی نکتہ کی تعلیم دیتا ہے کہ مومنانہ طرز زندگی میں باطل قوتوں کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت و مداہنت کی کوئی گنجائش نہیں۔ مومن کسی بھی حال میں کبھی باطل کے سامنے سرنگوں ہوسکتا ہے اور نہ کبھی اسے تسلیم کرسکتا ہے۔

شرک کا مفہوم اور اس کے مضمرات:

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ توحید کی ضد شرک ہے۔ خدا کی ذات و صفات میں کسی اور کو اس کا شریک گرداننے کو شرک کہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ہستی کے لئے ایک وصف ثابت ہو مگر کم اور مستعار درجے کا' جو اس کی شان مخلوقیت کے لائق ہو اور خدا کے لئے وہی وصف ثابت ہو' مگر کامل درجے کا اور اس کی شان خالقیت کے لائق تو احتمال شرک نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر قرآن حکیم انسان کو

سمیع و بصیر (دیکھنے اور سننے والا) قرار دیتا ہے۔

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ○ (الدھر ۷٦:۲)
پس ہم نے انسان کو سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے ○

انسان میں بلاشبہ یہ اوصاف سماعت و بصارت موجود ہیں لیکن کم تر اور ناقص درجے کے، جبکہ رب العزت کی ذات ان اوصاف سے بالذات متصف ہے اور اس کے یہ اوصاف درجہ کمال پر متحقق ہیں۔

ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۱)
بیشک وہی خوب سننے والا اور خوب دیکھنے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی بابت ارشاد خداوندی ہوا۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (التوبہ ۹:۱۲۸)
اور مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں ○

اور رب العزت نے خود اپنی نسبت بھی ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (البقرۃ ۲:۱۴۳)
بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والا مہربان ہے ○

علی ہذا القیاس نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرۃ ۲:۱۴۳)
اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو۔

اور خود اپنی بابت بھی اعلان فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدًا ○ (الحج ۲۲:۱۷)
بے شک اللہ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے ○

مذکورہ بالا صفات اور ان کے علاوہ بھی متعدد اوصاف میں خالق و مخلوق شریک ہیں مگر مختلف درجات و حیثیات کے ساتھ' اسی لئے ان تمام تقابلی صورتوں میں شرک کا احتمال پیدا نہیں ہوتا۔ شرک اس وقت لازم آتا ہے جب مخلوق میں خالق کے مساوی یا اس کے متوازی کوئی وصف تسلیم کیا جائے۔

اس تمہید کی روشنی میں اس اشکال کو رفع کرنا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کے بارے میں علم غیب کا عقیدہ رکھنے میں ہرگز ہرگز اس خیال کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس وصف میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام خداوند ذوالجلال کے شریک و مساوی ہیں حاشا و کلا ایسا اعتقاد کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس صحیح عقیدہ یہی ہے کہ خدا کا علم ذاتی' لافانی' مستقل بالذات' دائمی' ابدی اور غیر محدود ہے اور اس کو زوال و فنا نہیں جبکہ حضور علیہ السلام کا علم عطائی' وہبی' مستعار اور محدود ہے۔ ذہن میں اس اعتقاد کی کارفرمائی سے شرک کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ شرک تو اس وقت ہوگا جب دونوں کے علم غیب کو ہم پلہ اور ہم مقدار قرار دیا جائے چنانچہ محض کسی وصف میں خالق و مخلوق کی شرکت موجب شرک نہیں بنتی' البتہ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے ان میں یکسانی کا عقیدہ موجب کفر و شرک ٹھہرتا ہے۔

شہادت کا مفہوم:

شہادت کا لفظ شہود سے مشتق ہے اور شہود کا معنی بقول امام راغب اصفہانیؒ یہ ہے۔

الحضور مع المشاهدة اما بالبصر او بالبصيرة۔	کسی چیز کا حاضری کے ساتھ مشاہدہ کرنا خواہ بصر (آنکھ) سے ہو یا بصیرت (عقل کی نگاہ) سے۔
(المفردات بذیل شهد)	

اسی سے لفظ شاہد مشتق ہے اور قانون کی اصطلاح میں شاہد یعنی گواہ اس شخص کو تسلیم کیا جاتا ہے جو کسی وقوعہ کے وقت نہ صرف موقعہ واردات پر موجود ہو بلکہ آنکھوں سے اس واقعے کا مشاہدہ بھی کر چکا ہو۔ اگر کوئی شخص موقعہ پر موجود تو ہو لیکن بینائی اور بصارت سے محروم ہو تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جا سکتی اس لئے یہ لازم ٹھہرتا ہے کہ شاہد اسی کو تصور کیا جائے جس نے واقعے کا آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیا ہو۔

دنیا میں آنحضرت ﷺ سے پہلے جتنے بھی انبیاء کرام تشریف لائے ان کا ایمان محض کلمہ توحید یعنی ''لا الٰہ الا اللہ'' پر ہوتا تھا۔ رب العزت نے چاہا کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی بھی ہو جس کا توحید پر محض ایمان ہی نہ ہو بلکہ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے دنیا کے سامنے الوہیت خداوندی پر ذاتی شہادت فراہم کرے اور اعلانیہ طور پر عامتہ الناس کو بتلا دے کہ میں یہ سب کچھ محض علم و بصیرت کی بنا پر نہیں بلکہ مشاہدے اور معائنے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مبارک و مسعود ہستی سرور کائنات ﷺ کی ہے۔ معراج کی شب آپ کو ملکوت السموت والارض اور مکان و لامکان کی سیر کرائی گئی۔ کائنات کے ایک ایک ذرے کا مشاہدہ کرایا گیا۔ ان کے خواص و اوصاف پر مطلع کیا گیا اور سب سے آخر میں مشاہدہ رب ذوالجلال سے سرفرازی ہوئی عبد کامل اور خالق کے مابین تمام حجابات اٹھا لئے گئے اور بالآخر آپ ﷺ قرب کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام پر جا پہنچے جس کی رفعتوں کا اندازہ بھی چشم تصور نہیں کر سکتی۔ جلوۂ محبوب میں آنحضور ﷺ کے غایت انہماک اور قرب کا اعلان قرآن ان الفاظ میں کر رہا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰیO (النجم، ۵۳: ۱۷)

نہ درماندہ ہوئی چشم مصطفیٰ اور نہ حد ادب سے آگے بڑھی۔

شب معراج کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر آپ ﷺ کو کائنات ارضی و سماوی کا مشاہدہ کرایا گیا۔ حدیث میں مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''اللہ رب العزت نے اپنے دست قدرت کو میرے دونوں کندھوں کے درمیان ایسے رکھا کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اور برودت کو اپنے سینے میں محسوس کیا'' پھر فرمایا۔

فتجلی لی کل شی عرفت ما فی السمٰوٰت و الارض۔

(جامع الترمذی' ۲:۱۵۵' کتاب تفسیر القرآن سورۃ ص' رقم: ۳۲۳۵)

پس مجھ پر ہر چیز منکشف ہو گئی اور میں نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب جان لیا۔

انہی مشاہدات کی بنا پر آپ کا علم محض سماعی اور قیاسی نہ رہا بلکہ حضوری اور مشاہداتی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسی لئے آپ ﷺ موجودات کائنات کو علی وجہ البصیرت دیکھ کر پکار اٹھے کہ میں نے کائنات کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ لیا ہے اور اس میں موجود ہر ہر ذرے' ہر ہر گوشے' شجر و حجر' جن و انس' ارض و سما' کائنات بحر و بر الغرض کائنات عالم کی ہر ہر شے کی حقیقت کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ میں بر بنائے مشاہدہ گواہی دیتا ہوں کہ ان میں کسی میں بھی وصف الوہیت نہیں پایا جاتا۔ البتہ اس کائنات میں فقط ایک ہستی ایسی ہے جو ہر قسم کی عبادت و طاعت کی سزاوار مستحق ہے اور وہی نفع و نقصان کی مالک اور حاجت روا ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اس کی محبت سے دل کی دنیا کو آباد رکھا جائے' اسی سے عجز و نیاز کا اظہار کیا جائے اسی کے سامنے دست سوال روا نہ کیا جائے۔ اسی کے سامنے جبیں نیاز جھکائی جائے اور اسی کو قادر مطلق اور خود مختار مانا جائے' یہ واحد و یکتا ہستی اللہ رب العزت کی ہے کلمہ شہادت اسی مفہوم سے عبارت ہے۔

حضور ﷺ کی شہادت کے بعد کائنات میں توحید باری تعالیٰ کی شہادت کا

حق ادا ہو گیا۔ چنانچہ اب امت کے لئے کلمہ طیبہ ’’لا الہ الا اللہ‘‘ کہہ دینا ہی کافی ہے کیونکہ حضورﷺ کی شہادت سب کی طرف سے ہے۔

اقسام شہادت:

شہادت ہمیشہ دو طرح کی ہوتی ہے۔

☆ اصالتاً ☆ وکالتاً

اصالتاً شہادت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو دیکھ کر اس کے وجود پر شہادت دے۔ خاتم الانبیاﷺ کی شہادت اصالتاً تھی جب کہ دیگر انبیاء کرام اور آپﷺ کی امت کی شہادت وکالتاً ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں اعلان فرمایا گیا۔

وَکَذَالِکَ جَعَلۡنَاکُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا۔ (البقرۃ، ۲: ۱۴۳)	اور (اے مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تمہیں (اعتدال والی) بہتر امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور (ہمارا یہ برگزیدہ) رسول تم پر گواہ ہو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

فَکَیۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ کُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِیۡدٍ وَّ جِئۡنَابِکَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیۡدًاO (النساء، ۴: ۴۱)	پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور اے (حبیب) ہم آپ کو ان سب پر گواہ لائیں گےO

عقیدۂ توحید اور تصور وحدت میں امتیاز:

تصور وحدت اور عقیدہ توحید بظاہر تو مترادف تصورات دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے۔ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی کی

شہادت اگر محض اپنے علم' قیاس اور مشاہدے کی بنا پر دی جائے تو اسے تصور وحدت کہیں گے اور یہ شہادت' شہادت توحید نہیں ہو گی۔ یہ شہادت عقیدۂ توحید اس وقت قرار پائے گی جب یہ شہادت زبان مصطفویﷺ سے سن کر دی جائے کہ اللہ ایک ہے۔ چنانچہ سورۂ اخلاص جسے سورۂ توحید بھی کہتے ہیں۔ اس مضمون پر تفصیلاً روشنی ڈالتی ہے اس کا آغاز ہی ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے۔

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌO (اے رسول!) آپ فرما دیجئے (کہ) وہ اللہ ایک ہےO

(الاخلاص' ۱۱۲:۱)

حالانکہ یہ بھی کہا جا سکتا تھا۔

هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اللہ ایک ہے۔

مگر ایسا نہیں کہا گیا جس کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبرﷺ کے واسطے اور توسل کے بغیر رب العزت کی وحدانیت کی گواہی عقیدۂ توحید تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ تصور وحدت شہادت توحید تب بنتا ہے جب رب ذوالجلال کی وحدت و کبریائی کی شہادت زبان مصطفویﷺ پر اعتماد کرتے ہوئے دی جائے گویا اللہ کی وحدانیت کی گواہی بن دیکھے اس وجہ سے دی جائے کہ نبی کریمﷺ نے اس کی گواہی دی ہے۔ یہی ''ایمان بالغیب'' کا مقتضا ہے۔

باب دوم

حقیقت عبدیت محمدی ﷺ

اس باب میں کلمہ شہادت کے دوسرے حصے میں مذکور لفظ ''عبدہ'' پر شرط و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا جائے گا تا کہ حضور ختمی مرتبت ﷺ کے مقام عبدیت تک کچھ رسائی حاصل ہو سکے اور یہ حقیقت اجاگر ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ کا عبد (بندہ) ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور بارگاہ صمدیت میں عبدیت مصطفوی ﷺ کس مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔

لفظ 'عبد' کے مفہوم کے بارے میں مغالطہ اور اس کا ازالہ:

عربی زبان میں عبد کا معنی غلام اور بندہ آتا ہے اور کسی کے عبد ہونے کو عبدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عبد کے معنی و مفہوم کے بارے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک اشکار اور مغالطہ پایا جاتا ہے۔ غلط العام کے طور پر اس لفظ عبد کا اطلاق صرف انسان پر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اپنی معنوی وسعت کے اعتبار سے لفظ عبد جملہ موجودات کائنات کو محیط ہے۔ کائنات ارضی و سماوی میں موجود ہر چیز بارگاہ رب العزت میں عبد کا درجہ رکھتی ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو ہر وجود جو کتمان عدم سے عالم ہست میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ خدائے ذوالجلال کا مطیع و منقاد ہے اور اس کے نزدیک عبد کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہر وجود اپنی عبدیت کے اظہار کے طور پر اپنے احوال کی مناسبت سے اپنے خالق کے حضور جبین نیاز خم کر رہا ہے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ عبادت، پرستش اور بندگی کے لائق اور سزاوار صرف خالق کائنات کی ذات ہے جب کہ خلقت کے اعتبار سے عالم ارضی اور عالم بالا سے تعلق رکھنے والی ہر شے، جن و انس، ملائکہ، حیوانات، نباتات، جمادات، شجر و حجر غرضیکہ

کائنات بسیط کے ہر ہر گوشے میں پائی جانے والی ہر چیز اپنے خالق و مالک کے ساتھ رشتہ بندگی میں منسلک ہے۔ خالق کے ساتھ رشتہ بندگی کے استوار کر لینے کو مقام عبدیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کائنات زیریں و بالا کا ہر وجود خواہ وہ ذی روح ہو یا بے روح، بے شعور ہو یا باشعور معبود حقیقی کے حضور تسبیح و تہلیل اور عبادت و پرستش میں اپنے اپنے حسب حال محو و مصروف ہے۔ ارشاد قرآنی کے مطابق آسمانوں اور زمین میں ہر ایک کو اس کے مقام عبدیت سے روشناس اور آگاہ کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًاO (مریم ۱۹:۹۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی (آباد) ہیں (خواہ فرشتے ہیں یا (جن و انس) وہ اللہ کے حضور محض بندہ کے طور پر حاضر ہونیوالے ہیںo

متذکرہ صدر آیہ کریمہ سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کائنات ارضی و سماوی میں پائی جانے والی ہر نوع کی مخلوق اپنے مقام کی مناسبت سے درجہ عبدیت پر فائز ہے۔

قرآن حکیم میں باری تعالیٰ نے ایک مقام پر کفار و مشرکین کے اس غلط عقیدے کا بطلان بڑے واضح لفظوں میں کیا ہے جس کے مطابق وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ارشاد خداوندی ہے:

بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَO

بلکہ وہ (اللہ کے) معزز بندے ہیںo

(الانبیاء ۲۱:۲۶)

کلمہ شہادت میں عبدیت محمدی ﷺ کا تقدم:

یہ امر محتاجِ وضاحت نہیں کہ خالق نے اپنی جملہ مخلوق میں حضرت انسان کو

اشرف المخلوقات پیدا کیا اور اشرفیت کا تاج اس کے سر پر رکھ کر اسے عبدیت میں دوسروں سے ممتاز و سرفراز فرمایا۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی انسان جاہل ہے یا عالم، حاکم ہے یا محکوم، کمزور ہے یا طاقتور، نیکوکار ہے یا بدکار اس کی عبدیت کو دوسری تمام مخلوق سے متمیز کرتے ہوئے بلندتر درجہ پر فائز کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے لازمی و لابدی ہے کہ وہ اپنے مقام عبدیت سے کماحقہ آگاہ ہو اور اس بات کا بشرح صدر اقرار بھی کرے کہ اس کی عبدیت دوسری تمام مخلوق کے مقابلے میں تقدم اور اولیت کے مرتبے کی حامل ہے۔

سرور دو جہاں ﷺ کی ذات گرامی تمام بنی آدم کے مقابلے میں عبد کامل کے مقام و مرتبہ پر فائز ہے۔ یہاں یہ امر محل غور ہے کہ آنحضور ﷺ کی رسالت کے اقرار و اعلان سے پہلے آپ ﷺ کے مقام عبدیت کے تقدم کو جزو ایمان ٹھہرایا گیا اور دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے ہر ایک پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لانے سے پہلے آپ کی عبدیت کی شہادت ان کلمات کو اپنی زبان سے ادا کرتے ہوئے دے۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

روایات و آثار دور نبوت سے بالتواتر ثابت ہے کہ دوران نماز حالت تشہد میں کلمہ شہادت ادا کرنے کے علاوہ حضور ﷺ اکثر لوگوں کے سامنے یہ کلمہ پڑھا کرتے تھے، یعنی آپ ﷺ اپنی نبوت و رسالت کے اعلان سے پہلے اپنی عبدیت کا اقرار فرماتے۔

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ مقام عبدیت و رسالت میں گہرا ربط و تعلق

کارفرما ہے جس کی تفہیم تصور توحید کی اساس ہے۔ یہ بات جان لینا ازبس ضروری ہے کہ آنحضورﷺ کا وصف عبدیت اللہ جل مجدہ کی عطا ہے جب کہ آپﷺ کا مقام رسالت آپﷺ پر خدائے بزرگ و برتر کا خاص انعام اور عطیہ ہے۔ اسی بنا پر نبی کریمﷺ اپنے مقام عبدیت کا خصوصیت کے ساتھ سب سے پہلے ذکر فرماتے اور پھر اس کے بعد اس عظیم انعام و عطیہ خداوند کا تذکرہ فرماتے جو بارگاہ صمدیت سے رسالت کی صورت میں آپﷺ کو عطا ہوا تھا۔

شہادت رسالت پر شہادت عبدیت کو مقدم کرنے کے اسباب:

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ عبدیت اور رسالت آقائے دو جہاںﷺ کی دو امتیازی شانیں ہیں، جن کا کلمہ شہادت میں ذکر کیا گیا ہے۔ شہادت رسالت پر شہادت عبدیت کو مقدم کرنے کے تین اسباب ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

پہلا سبب:

آنحضورﷺ کے مقام عبدیت و رسالت کے باہمی ربط کو سمجھ لینے سے یہ نکتہ واضح طور پر آشکار ہو جائے گا کہ عبدیت کا تعلق کلیتہً ذات خداوندی سے ہے۔ اور غیر اللہ سے اس کی کوئی نسبت نہیں اس کے برعکس رسالت کا تعلق ایک طرف براہ راست مخلوق خداوندی سے ہے تو دوسری طرف ذات خداوندی سے بھی ہے۔ گویا رسالت خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہے چونکہ عبدیت کا مطمع نظر سب علائق دنیوی منقطع کر کے خالق حقیقی سے ایسا یک گونہ تعلق استوار کر لینا ہے کہ اسی کی ذات بندے کے کامل انہماک اور توجہ تام کا مرکز و محور بن جائے اس بنا پر کلمہ شہادت میں اس کے ذکر کو اولیت دی گئی ہے۔ اس کے باوصف منصب رسالت' الوہی پیغام کو نوع انسانیت تک پہنچانے کا متقاضی ہے۔ رسول کا کام بندگان خدا کی رشد و

ہدایت ہے تاکہ وہ گمراہی و ضلالت کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و ایقان کے نور سے بہرہ ور ہو جائیں۔ مقام عبدیت پر جہاں توجہ الی اللہ کا رنگ غالب ہوتا ہے وہاں مقام رسالت پر توجہ الی المخلوق کی کیفیت کا اثر بغائت درجہ گہرا رہتا ہے' کیونکہ رسول کو اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ خلق خدا کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے منصب رسالت پر فائز کیا جاتا ہے۔

دوسرا سبب:

یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ مقام رسالت ایک عبد کے مقابلے میں بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے لیکن جہاں تک عبدیت کا تعلق ہے رسول کی ذات خدا سے اپنا رشتہ عبودیت محکم طور پر قائم کرنے کو اولیت و ترجیح دیتی ہے۔ آقائے دوجہاں ﷺ کا ایک ارشاد گرامی اس مضمون پر دلالت کرتا ہے کہ اے میرے رب! میں تیرا رسول برحق ہوں اور میری رسالت تیرے گم کردہ راہ بندوں کو رشد و ہدایت سے بہرہ ور کرنے کے لئے ہے' لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ اول و آخر تیرا بندہ رہوں۔ یہی سبب تھا کہ حضور ﷺ نے کلمہ شہادت میں اپنے مقام بندگی کا بالتخصیص پہلے ذکر فرمایا اور رسالت کا بعد میں' عبدیت اور بندگی کے مقام میں جو لذت وحلاوت اور سرشاری کی کیفیت پنہاں ہے اس کا ذکر اقبالؒ نے کیا خوب کیا ہے۔

؎ متاع بے بہا ہے درد وسوز و آرزومندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

تیسرا سبب :

کلمہ شہادت میں مقام عبدیت کو اولیت دینے کی تیسری حکمت یہ ہے کہ بنی آدم کے قلوب واذہان میں ازرہ تعلیم یہ نکتہ جاگزیں کر دیا جائے کہ جب آقائے دوجہاں صاحب لولاک ﷺ سے بڑھ کر کائنات میں کسی فرد کو بارگاہ صمدیت میں عظمت و رفعت کا وہ مقام حاصل نہیں جو آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو حاصل ہے اور آپ ان سب عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہونے کے باوجود اپنے مقام بندگی سے دستبردار نہیں ہوئے تو اور کوئی کس قطار و شمار میں ہوسکتا ہے۔ گویا نکتہ توحید کو قلب انسانی میں راسخ کرنے کے لئے عبدیت مصطفوی ﷺ کو اس تخصص کے ساتھ متحقق کیا گیا کہ جب معراج میں قاب قوسین کے مقام پر آپ ﷺ کی عبدیت میں سرمو کوئی فرق نہیں آیا تو اور کون سی ہستی خدا کے بعد الوہیت اور معبودیت کی مستحق اور سزاوار ہوسکتی ہے۔ کلمہ شہادت میں ذکر عبدیت کے تقدم میں اسی حکمت کی کارفرمائی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔

حقیقت مقام عبدیت:

مقام عبدیت کی اصل اور حقیقت کیا ہے؟ اس کی نشاندہی تو اقبال نے بزبان شعر یوں کی ہے

؎ متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی

کہہ کر مجملاً کر دی تھی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بندگی بارگاہ رب العزت میں بغایت درجہ عاجزی فروتنی، بے مائیگی اور کمال تذلل کا نام ہے اور مقام عبدیت اس احساس سے بدرجہ اتم سرشار ہونے سے عبارت ہے۔ بندہ جوں جوں حریم ناز خداوندی میں فرط عجز و نیاز سے جھکتا چلا جاتا ہے تو اس کا جوہر زندگی کھلنے

لگتا ہے اور وہ مقام عبدیت میں پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے جب بندہ خود کو عاجز، بے بس، قصوروار و خطاکار سمجھ کر انفعال و ندامت کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے تو بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہوتے ہی اس کے قلب و باطن میں عبدیت کا نور بھر دیا جاتا ہے اور انوار الٰہیہ اس کی باطنی کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس کی جبینِ بندگی جس قدر فرط عجز و انکسار سے خالق کائنات کے حضور خم ہوتی ہے اس کا مقام عبدیت نئی بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔

آنحضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

وما تواضع احد للہ رفعہ اللہ۔

(صحیح مسلم، ۲: ۳۲۱، کتاب البر و الصلہ و الآداب، باب استحباب العفو والتواضع، رقم: ۶۹)

جو کوئی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ کریم اسے رفعت و بلندی عطا کرتا ہے۔

یہ فرمودہ مصطفوی ﷺ ہم سب کے لئے حرز جاں بنانے کے لائق ہے۔

کیا ہم نے کبھی غور کیا کہ نشہ پندار میں بدمست ہو کر ہم خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں اور مخلوق خداوندی کو حقیر و ادنیٰ سمجھتے ہیں۔ کیا اس غرور و رعونیت پر مبنی طرز عمل اپنا کر ہم اس حقیقت سے ناآشنا نہیں کہ خدا کی نظر میں ہم کتنے گر چکے ہیں اور دنیا میں ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ بارگاہ خداوندی میں حقیقی عزت اس کی بارگاہ بے ہمتا کے آگے جھکنے اور بندگان خدا سے تواضع، خاکساری اور عجز و انکسار کا انداز اختیار کئے رکھنے میں مضمر ہے۔ یاد رہے کہ جو شجر جتنا ثمردار ہوتا ہے وہ اتنا ہی جھکا ہوا ہوتا ہے۔

قصہ آدم علیہ السلام میں نیابت خداوندی کا تصور:

نسل انسانی کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام سلسلہ آفرینش کے وہ پہلے فرد

ہیں جنہیں خالق کائنات نے بر روئے زمین اپنی خلافت و نیابت کے لئے منتخب فرمایا اور ان کی تخلیق سے پہلے فرشتوں کو اپنے ارادے سے حسب ارشاد قرآنی ان الفاظ سے آگاہ کیا۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلَائِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ (البقرۃ‘ ۲:۳۰)	اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

خلیفہ کسی نائب یا قائم مقام کو کہا جاتا ہے۔ عام دستور ہے کہ جب کوئی مقتدر اور بااختیار شخصیت کسی کو اپنی نیابت سپرد کرنا چاہتی ہے تو اس کی نگاہ انتخاب ایسی ہستی پر پڑتی ہے جو بہمہ وجود اس اعلیٰ و ارفع منصب کی اہل ہو اور اس کی صلاحیت واستعداد پر کامل طور پر بھروسہ کیا جا سکتا ہو۔

حضرت آدم اور صدور نسیاں:

حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی کی ذمہ داریاں سونپتے وقت خالق کائنات سے کسی غلطی کے صدور کا امکان خارج از بحث ہے کہ وہ ذات ہر قسم کی بھول چوک اور خطاء سے یکسر پاک ہے اور یہ بات حیطہ گمان میں بھی نہیں لائی جا سکتی کہ منصب خلافت کے لئے وہ کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کرے جس سے حکم عدولی اور نافرمانی کا ارتکاب ممکن ہو۔ بتقاضائے بشریت یہ بات انسانوں سے تو ممکن ہو سکتی ہے کہ ان کی فطرت اور سرشت میں محدود علم کی بنا پر غلطی اور خطا کا امکان ہمہ وقت موجود ہوتا ہے لیکن خدائے خبیر و علیم کے بارے میں ایسا قیاس کرنا محال و ناممکنات میں سے ہے۔ قصہ تخلیق آدم کے باب میں قرآن حکیم کا یہ ارشاد

فرمانا کہ:

وَ عَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰىO (طٰہٰ ۲۰:۱۲۱) — اور آدم سے اپنے رب کے حکم (کو سمجھنے) میں فروگذاشت ہوئی۔

ایک عجیب طرفہ تماشا اور کائنات معمہ و عقدہ ہے' جس کی گرہ کشائی عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ خلیفۃ اللہ اور نائب الٰہی سے عصیاں اور حکم عدولی کا صدور اور شجر ممنوعہ کا ثمر کھانے کی پاداش میں ان کا جنت سے اخراج کی حکمتوں اور مصلحتوں کا حامل ہے۔ یہاں ایک لطیف نکتہ قابل توجہ ہے کہ جہاں قرآن نے حضرت آدم سے غلطی سرزد ہونے کا ذکر فرمایا وہاں اس بات کا تذکرہ بھی مناسب جانا۔

فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًاO (طٰہٰ ۲۰:۱۱۵) — سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں بالکل (نافرمانی کا کوئی) ارادہ نہیں پایاO

محولہ بالا آیت سے یہ مفہوم مترشح ہے کہ ثمر ممنوعہ کھانے میں حضرت آدم سے نسیان سرزد ہوا' اور انہوں نے بالارادہ غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ گویا اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جا رہا ہے کہ حضرت آدم سے صرف بھول چوک ہوئی اور ان کے دل میں حکم عدولی کا کوئی قصد اور ارادہ نہ تھا۔

شریعت اسلامیہ کی رو سے ایسا عمل جس کے پیچھے ارادہ کارفرما نہ ہو خطا اور لغزش پر تو محمول کیا جا سکتا ہے لیکن اسے گناہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یاد رہے کہ ارادے کی عدم موجودگی میں کوئی عمل لائق سرزنش نہیں ٹھہرتا۔ مثال کے طور پر رمضان میں بھولے سے سیر ہو کر بھی کھا لیا جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ جب کہ بالقصد ایسا کرنے سے کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

خلافت ارضی کے لئے تربیت آدم کے حکمت آموز پہلو

قرآن حکیم کی متذکرہ صدر دو آیات کریمہ میں ایک آیت حضرت آدم کی حکم عدولی کا ذکر کرتی ہے تو دوسری آیت میں ان سے بھول چوک اور نسیان منسوب کر کے انہیں مبراعن الخطا قرار دیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں آیات میں تضاد اور تعارض پایا جاتا ہے۔ حالانکہ کلام الٰہی کسی قسم کے تضاد سے یکسر پاک ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ "**فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمت**" (حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا) کے مصداق مذکورہ ارشادات ربانی چند حکمتوں پر مبنی ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ خلافت و نیابت الٰہی کے باب میں باری تعالیٰ نے اپنی مشیت کاملہ سے حضرت آدم کی ذہنی وفکری تربیت اس نہج پر کرنا چاہی تا کہ انہیں عبدیت کے بلند مقام پر سرفراز کیا جا سکے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ تربیت دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے جس میں ایک اس کا ظاہری پہلو ہوتا ہے اور دوسرا باطنی' مربی (تربیت دینے والا) کی ذات چاہتی ہے کہ اپنے مربوب (جسے تربیت دی جا رہی ہے) میں پوشیدہ حکمتوں کو بروئے کار لا کر کامل صلاحیت اور استعداد پیدا کر دی جائے جس کا متقاضی وہ عظیم منصب ہے جس پر اسے فائز کیا جانے والا ہے۔

واقعہ آدم میں یہ لطیف نکتہ مضمر ہے کہ جہاں ایک طرف حضرت آدم کی لغزش محض کو عصیاں سے تعبیر کیا جا رہا ہے وہاں دوسری طرف اس بات کی شہادت بھی خود ذات خداوندی فراہم کر رہی ہے کہ ان سے یہ فعل نادانستہ بھول چوک کے نتیجے میں سرزد ہوا اور ان کا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سرشت آدم میں خطا ونسیان کے یہ دونوں

پہلو اس خصوصی تربیت کا لازمی حصہ تھے' جن سے حضرت آدم کو ان کی عبدیت کی تکمیل کے لئے گزارا جانا تھا' تاکہ ان کے اور ان کی وساطت سے بنی آدم کے دل و دماغ میں یہ تصور کامل طور پر راسخ کر دیا جائے کہ انسان خطا ونسیان کا پتلا ہے اور اس کا مقام بندگی اس وقت اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے جب اس میں احساس خطا سے شرمندگی' انفعال اور ندامت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر جب حضرت آدم جنت سے نکالے گئے اور روئے ارض ان کا مسکن اور مستقر ٹھہرا تو اس تقصیر کی وجہ سے' جو ان سے بے ارادہ سرزد ہوئی ان پر اس درجہ احساس ندامت طاری ہوا کہ مسلسل گریہ وزاری اور استغفار ان کا شیوہ اور وظیفہ حیات بن گیا۔

حضرت آدم کا مقامِ عبدیت:

جب مسلسل گریہ' نالہ و زاری اور آہ وفریاد سے حضرت آدم کے شب و روز عبارت ہو گئے اور خدا کے دامنِ رحمت سے لپٹ کر عفو طلبی ان کا شعار بن گیا تو ان کا مقامِ عبدیت بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہو گیا۔ قران حکیم نے حضرت آدم کے توبہ و استغفار کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَO	اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو نے ہم کو نہ بخشا اور ہم پر رحم (نہ) فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔
(الاعراف' ۷:۲۳)	

حضرت آدم کا یہ رونا دھونا اور اپنی تقصیر پر احساس ندامت کا اظہار بارگاہ رب العزت میں اتنا محبوب اور پسندیدہ ہوا کہ انہیں ان کے منصب خلافت کے

شایان شان عبدیت کے بلند تر مقام پر فائز کر دیا گیا پھر انہیں دربار خداوندی میں جوشرف باریابی عطا ہوا' اس کا ذکر قرآن حکیم میں اس طرح کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰی٥	پھر ان کے رب نے انہیں چن لیا اور ان پر (عفوو رحمت کی خاص) توجہ فرمائی٥

(طٰہٰ ۲۰:۱۲۲)

حضرت آدم کی توبہ اس شان سے شرف قبولیت سے بہرہ ور ہوئی کہ رشد و ہدایت کے ارفع و اعلٰی مقام پر متمکن کر دیا گیا۔ یہ مقام انہیں اس امتحان اور ابتلا سے گزرنے کے بعد نصیب ہوا جو خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز کرنے سے پہلے ان کی تربیت کے لئے ضروری اور ناگزیر تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے مقام عبدیت کے علاوہ چند برگزیدہ انبیاءکرام اور خاصان امت کے مقام عبدیت کا تذکرہ ذیل میں درج ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام اور مقام عبدیت:

قرآن حکیم میں حضرت آدم کے بعد جس برگزیدہ نبی کا ذکر تواتر کے ساتھ آیا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں' جن کی زبان سے نکلی ہوئی بددعا ان کی قوم کے حق میں ایسے عذاب کا پیش خیمہ بنی جس میں مبتلا ہو کر وہ قوم صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی۔ حضرت نوحؑ جب اپنے رب کے حضور دعا کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو وہ عجز و نیاز اور تضرع و خاکساری کا پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی نظر پیہم اپنی لغزشوں اور خطاؤں پر ہے اور وہ خدا کے دامن کرم سے لپٹے ہوئے انتہائی عاجزی و زاری سے اپنی مغفرت کے لئے قرآنی الفاظ میں یوں سراپا سوال ہیں۔

وَاِلَّا تَغْفِرْلِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ اَکُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَO — اور اگر تو مجھے نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم (نہ) فرمائے گا (تو) میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گاo (ہود۱۱:۴۷)

بارگاہ صمدیت میں وہ اپنی پیغمبرانہ معصومیت اور عظمت پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ عفو و رحمت طلبی کے لئے دست بدعا ہیں۔ ان کی نظر خدا کے بے پایاں الطاف و عنایات پر ہے جن سے محرومی خسارہ و نقصان کا موجب بنتی ہے۔ مقام غور ہے کہ اگر نوحؑ جیسے صاحب عظمت نبی کا اظہار بندگی اس کیفیت کا حامل ہے تو ہم روسیاہ اور معصیت کوش بندے کس شمار و قطار میں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مقام عبدیت:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ خدا تعالیٰ کے وہ محبوب پیغمبر ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم میں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کثرت سے وارد ہوا ہے۔ انہیں سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد ہونے کا شرف و امتیاز بھی حاصل ہے۔ وہ پہلے نبی ہیں جن کا دائرہ نبوت عالمگیر حیثیت کا حامل ہے۔ ایسے بلند پایہ عظیم المرتبت نبی بھی جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ''ابی ابرہیم'' کہہ کر فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعاؤں کا ثمرہ ہوں' بارگاہ خداوندی میں وفور عجز و نیاز' انکساری و تضرع سے التجا کیا کرتے تھے۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِO — اور اسی سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز قیامت وہ میری خطائیں معاف فرما دے گاo (الشعراء ۲۶:۸۲)

اللہ رب العزت کی شان رحیمی اور اوصاف کریمانہ سے وہ یہ امید وابستہ

کئے ہوئے تھے کہ قیامت کے دن ان کی خطائیں معاف کی جائیں گی اور ان سے ان کی لغزشوں کے بارے میں بازپرس اور مواخذہ نہ کیا جائے گا۔ حضرت ابراہیمؑ کا مقام بندگی اپنی عظمتوں اور رفعتوں کے باوصف یہ حقیقت آشکارا کر رہا ہے کہ بارگاہ خداوندی میں بے مائگی، عاجزی اور تذلل کا احساس ہی بندے کو عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے اور وہاں تکبر، غرور، تفاخر اور جاہ پسندی کا اظہار قابل قبول نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور مقام عبدیت:

حضرت سلیمانؑ کو جو شان و شوکت، کر و فر اور دبدبہ حکومت عطا ہوا وہ ازل سے ابد تک کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ اللہ کے اس جلیل القدر نبی کی حکومت کا دائرہ اور اختیار کا تصرف جن و انس اور ہواؤں پر بھی محیط تھا۔ اتنے بڑے انعام اور عطیہ الٰہی کے باوجود جو حضرت سلیمانؑ کے بے مثال عظمت و مرتبہ پر دلالت کرتا ہے ان کا مقام بندگی نہایت درجہ عاجزی و فروتنی اور نیاز مندی کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ اس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ملکہ سبا بلقیس کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے لکھا تھا اور جس کا آغاز قرانی الفاظ کے مطابق اس طرح کیا گیا تھا۔

اِنَّهٗ مِنۡ سُلَيۡمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِۙ○ (النمل، ۲۷:۳۰)	بے شک وہ (خط) سلیمان کی جانب سے (آیا) ہے اور وہ اللہ کے نام سے شروع (کیا گیا) ہے جو بے حد مہربان بڑا رحم فرمانے والا ہے○

یہ انداز تحریر جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی قسم کا سابقہ، لاحقہ یا امتیازی شان کا حامل لقب اپنے نام کے ساتھ استعمال نہیں کیا، بلکہ سیدھے سادھے طریقے سے خط کو خدا کے پاک نام سے شروع کیا۔ یہ اس بات کا غماز ہے کہ خدا

کی ذات کبریا کے آگے حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا صاحب جاہ و سلطنت بادشاہ بھی محض بندۂ بے بس ہے اور ان کا حد سے بڑھتا ہوا عجز و نیاز ان کے مقام عبدیت کی رفعت کا آئینہ دار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مقام عبدیت:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ اولالعزم اور صاحب ہمت نبی ہیں جنہیں ان کی قوم بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم اور استحصال سے نجات دلانے کے لئے مبعوث فرمایا گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے قوم فرعون سے تعلق رکھنے والے ایک قبطی فرد غیر ارادی طور پر قتل ہو گیا تو وہ اپنے اس اضطراری فعل پر اس درجہ نادم ہوئے کہ اپنے رب کے حضور تضرع و زاری سے دعائیں مانگنے لگے۔

رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ۔ (القصص، ۱۶:۲۸)

اے میرے پروردگار! بیشک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا پس مجھے بخش دیجئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہونے کی بنا پر کلیم اللہ کے لقب سے نوازا گیا۔ حضرات انبیاء میں وہ واحد نبی ہیں جنہیں حضور علیہ السلام نے جزوی طور پر اپنے مماثل قرار دیا ہے انہوں نے ''رب ارنی'' کی درخواست گزار کر دیدار الٰہی کی درخواست کی۔ ایسے بلند پایہ اور عالی مرتبت نبی کا مقام عبدیت خوف و خشیت خداوندی سے اس درجہ مملو ہے کہ وہ قبطی کے نادانستہ قتل پر خدائے قدوس سے معافی کے خواستگار رہتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مقام عبدیت

سرور دوجہاں، تاجدار انبیا صلی اللہ علیہ وسلم جن کا مثیل ازل سے ابد تک کائنات کا

کوئی متنفس نہیں ایسے مہتم بالشان اور کمال کی انتہاؤں کو چھونے والے مقام عبدیت کے حامل ہیں جو انتہائی نیاز مندی، فروتنی اور احساس بندگی سے عبارت ہے۔ یہ بات ذہن میں مستحضر رہے کہ اگر کوئی امتی ایسے خیالات کو آنحضورﷺ کے بارے میں اپنے گوشہ دل میں جگہ دے جو آپﷺ اپنے اظہار عبدیت کے طور پر زبان مبارک پر لاتے تھے تو وہ اپنے ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

تواتر کے ساتھ روایات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ آقائے دوجہاںﷺ کا مقام بندگی اس انتہا درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ آپ عبادت کے لئے ساری ساری رات کھڑے رہتے یہاں تک کہ پاؤں مبارک متورم ہو جاتے۔ آپﷺ پر اکثر شدت گریہ کی وہ کیفیت طاری ہوتی کہ آپ کا رواں رواں کانپنے لگتا۔ ایک دفعہ اسی کیفیت کا غلبہ تھا کہ خدائے ذوالجلال نے جبرائیل امین کے توسط سے اپنے محبوب کے پاس یہ پیغام بھیجا۔

طٰهٰ ○ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ○	طٰہٰ (اے محبوب مکرم) ہم نے آپ پر قرآن (اسلئے) نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔
(طٰہٰ، ۲۰:۱۔۲)	

یہ تو محبّ کا اپنے محبوب سے اظہار محبت کا معاملہ تھا مگر بایں ہمہ حضورﷺ کا شغف عبادت اس کمال درجے کا تھا کہ بادیدۂ گریاں بارگاہ صمدیت میں حاضر ہو کر عرض کرتے۔ آنحضورﷺ اکثر دعا مانگتے کہ اے باری تعالیٰ مجھے اپنی یاد میں رونے والی آنکھیں اور محبت میں مگن رہنے والا دل عطا فرما، صحابہ رضی اللہ عنہم حضورﷺ کے کثرت گریہ کو دیکھ کر عرض پرداز ہوتے کہ آقا آپ تو محبوب خدا ہیں اور آپ کی ذات تو وہ ذات ہے جس کے دامن میں گناہگار امتیوں کو بھی مژدہ مغفرت عطا ہوتا ہے، پھر آپ کے اضطراب و التہاب اور کثرت گریہ کا سبب کیا

ہے؟

آپ ﷺ احساس عبدیت سے سرشار ہو کر فرماتے۔

أفلا اکون عبداً شکورا۔ کیا میں اپنے رب کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

(صحیح البخاری، ۲:۷۱۷، کتاب التفسیر الفتح، رقم: ۴۵۵۷)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مقام عبدیت

ہادی دوجہاں ﷺ کی صحبت کا رنگ ان کے جاں نثار اصحاب پر اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں آپ کے اسوہ حسنہ کی اتباع کو جزو ایمان سمجھتے تھے۔ تربیت مصطفوی ﷺ کا اثر ان کی زندگیوں میں کس حد تک سرایت کر چکا تھا اس کا نقشہ قرآن حکیم ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ۔

(آل عمران، ۳:۱۹۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اسکی عظمت اور حسن کے جلوؤں) میں فکر کرتے رہتے ہیں۔

حضور ﷺ کے صحابہ وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہیں خدائے قدوس نے ''رضی اللہ عنہم و رضوعنہ'' کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا اور انہیں بخشش و مغفرت کا مژدہ جانفزا بارگاہ رب العزت کی طرف سے ملا ان کے بارے میں خود آقائے نامدار ﷺ کا یہ ارشاد

گرامی روایات میں ہے کہ اگر کسی نے دنیا میں اہل جنت کا نظارہ کرنا ہو تو وہ میرے صحابہ کو دیکھ لے۔

صحابہ کی للّٰھیت، خدا خوفی اور کروٹ کروٹ یاد الٰہی میں مگن رہنے کا حال قرآن حکیم نے کھول کر بیان کیا ہے وہ منتخب روزگار ہستیاں ہمہ وقت رضائے الٰہی کے حصول کے لئے مصروف جدوجہد رہتیں اور ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اس کیفیت سے خالی نہیں تھا۔ ان کا مقام عبدیت اس درجے کا تھا کہ صحبت مصطفوی ﷺ کے فیض سے مالا مال اور سرتاپا نیکیوں کا پیکر ہونے کے باوجود انہیں اپنے اعمال پر کوئی فخر نہ تھا بلکہ وہ خشیت الٰہی سے لرزہ براندام رہتے ہوئے قران کے الفاظ میں رضائے خداوندی کے حصول کو اپنا مطمع نظر بنائے رکھتے۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا۔ (الفتح، ۴۸:۲۹)

وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔

اپنے اعمال صالحہ پر فخر و تعلّی کا اظہار تو درکنار وہ عذاب جہنم کے خوف سے لرزاں و ترساں اپنے رب کے حضور دست بدعا رہتے۔

سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ O (آل عمران، ۳:۱۹۱)

تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے O

صحابہ کرام کو زندگی گزارنے کا یہ قرینہ بارگاہ مصطفوی ﷺ سے عطا ہوا تھا اور ان کے شب و روز آنحضور ﷺ کی سیرت مبارکہ کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے۔

اب ہم مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر صحابہ و صحابیات میں سے چند

ایک نادرۂ روزگار ہستیوں کے مقام بندگی کا طائرانہ جائزہ لیتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور مقام عبدیت:

یہ وہ دوسرے خلیفہ راشد ہیں جن کی ہیبت و دبدبے سے قیصر و کسریٰ لرزہ براندام تھے اور ان کا نام سن کر سلاطین عجم کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ ان کے مقام عبدیت کا ایک انتہائی سبق آموز واقعہ کتب تاریخ میں درج ہے۔

ایک رات مدینے کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر دیکھا کہ امیر المومنین اپنی پشت پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے ہوئے اپنے خادم سے کہہ رہے ہیں کہ ''اٹھ اور وہ درہ ہاتھ میں لے کر عمرؓ کو اہل حاجت کے دروازوں پر لے جا۔'' وہ خادم اپنے آقا کی یہ حالت دیکھ کر لرز گیا اور بچشم نم عرض کرنے لگا کہ ''آپ خود تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟ مجھے حکم دیجئے کہ میں حاجت مندوں کے گھروں میں ان کی ضرورت کی چیزیں پہنچا آؤں۔'' فاروق اعظمؓ فرمانے لگے کہ ''نہیں میں نے آج اپنے نفس کو سزا دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج مجھے لحظہ بھر کے لئے یہ خیال آ گیا تھا کہ میں اتنا بڑا حکمران ہوں کہ عرب و عجم کے لوگ میرا نام سن کر تھرتھرا اٹھتے ہیں اب اس نفس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں ایک سقے کی طرح پانی کا مشکیزہ اٹھاؤں' لوگوں کے گھروں میں جا کر صدا لگاؤں کہ تمہارے شہر کا سقہ پانی لئے حاضر ہے۔

خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ:

سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس لخت جگر کا مقام بندگی ہمارے طبقہ نسواں کے لئے انتہائی سبق آموز ہے۔ وہ بلاشبہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں جن کی سیرت قیامت تک آنے والی خواتین کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کے

قدموں پر دونوں جہاں کی نعمتیں نثار تھیں ان کے شب و روز خدا کی عبادت اور محنت و مشقت کے ماحول میں بسر ہوتے تھے موسم سرما کی طویل راتوں میں وہ سجدے میں سر رکھتیں تو وہ سجدہ اتنا طول کھینچتا کہ فجر کی اذان سنائی دینے لگتی وہ سرد آہ بھر کر کہتیں کہ ''مولا! تو نے راتیں کتنی چھوٹی بنائی ہیں کہ جی بھر کر تیرا سجدہ بھی ادا نہیں ہوتا۔''

یہ اس خاتون کا مقام عبدیت ہے جس کے بارے میں روایت درج ہے کہ وہ روز قیامت جب میدان حشر برپا ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے کہ 'لوگو اپنی آنکھیں نیچی کر لو خاتون جنت کی سواری گزرنے والی ہے۔

پاکان امت اور عرفائے کاملین:

صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں ایسے ایسے باکمال اولیا وصلحا گزرے ہیں جن کی عبدیت کا درجہ خلق خدا میں انتہائی رفعت و بلندی پر تھا۔ اللہ کے ان برگزیدہ اور صالح بندوں کے فیوض و برکات سے آج بھی ایک عالم بہرہ ور ہو رہا ہے اور سچ پوچھئے تو دنیا کا وجود ان کے دم قدم سے قائم ہے۔ ان کی عبدیت کے جواہر پارے آج بھی اس تیرہ و تار کائنات میں ضیا پاشیاں کر رہے ہیں۔ ان کے آستانے سے حرماں نصیبوں کو آج کے اس مادی دور میں بھی گوہر مراد مل جاتا ہے۔ ان بزرگوں کے مقام بندگی کے بے شمار واقعات ہیں۔

کشف المحجوب میں ایک ولی کامل کے باب میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی۔ ''اے فلاں! کیا تو نے اپنے آپ کو اتنا پاک سمجھ لیا ہے کہ میرے گھر میں حاضری کے قابل ہو گیا ہے؟'' وہ یہ آواز سن کر ٹھٹک گئے اور ان کے قدم وہیں رک گئے۔ تھوری دیر بعد آگے قدم اٹھایا تو پھر آواز آئی ''کیا تجھے اس مقام تک رسائی حاصل ہو گئی ہے کہ میرا حق بندگی ادا

کر سکے۔ وہ حیران و ششدرہ گئے یہ سمجھ کر کہ اس بارگہ ناز کے قابل نہیں، پیچھے ہٹنے لگے تھے کہ پھر آواز آئی کیا تو اس قدر سرکش ہو گیا ہے کہ میرے آستانے سے منہ موڑ کے جا رہا ہے، یہ سن کر وہ بے اختیار آہ و زاری کرنے لگے تو صدا آئی کیا تو مجھ سے شکوہ کرنے لگا ہے، وہ یہ سن کر خاموش ہو گئے تو ندا آئی کیا لبوں پر مہر سکوت لگا کر تو اپنے آپ کو مقام صبر پر فائز سمجھ بیٹھا ہے۔ اللہ کا یہ ولی یہ سن کر بے ہوش ہو گیا اور دیر تک یہ کیفیت رہی جب ہوش آیا تو عرض کرنے لگا مولا میں کچھ نہیں جانتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں میں تجھ سے تیری ہدایت کا طلب گار ہوں کہ تیرا حق بندگی کیسے ادا کروں۔

ایک ولی کامل کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں لوگوں کو اس لئے حلقہ ارادت میں شامل کرتا ہوں کہ شاید میرے مریدوں میں کوئی ایسا شخص شامل ہو جس کا بیعت کرنا کل قیامت کے دن میرے لئے وسیلہ نجات بن جائے۔

ان پاکباز، صالح اور متقی بزرگوں کی انکساری، عاجزی اور فروتنی کی شان بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ (الفرقان، ۲۵:۶۳)	اور اللہ کے (مقبول) بندے وہ ہیں جو زمین پر منکسر مزاجی سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو (ان کو) سلام کرتے ہیں ○

یہ متواضع، خلیق اور انتہائی نرم روی سے خدا کی زمین پر چلنے والے بندے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وہ کسی سے زیادتی نہیں کرتے اور اگر کسی جاہل کندہ ناتراش شخص سے ان کا سامنا ہو جائے تو ''صاحب سلامت'' کہتے ہوئے گزر

جاتے ہیں تواضع اور خاکساری ان کا چلن اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانا ان کا شعار ہے۔عبدیت کا یہ جوہر ہی اسلام کی روح ہے جس کا دعوی کرنا تو آسان ہے لیکن اس خاردار وادی سے عافیت کے ساتھ گزر جانا انتہائی جان جوکھوں کا کام ہے۔ مقام عبدیت میں یہی مشکل مرحلہ ہے ۔جس کے بارے میں اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے

ؔ یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

عبدیت مصطفویﷺ اور کم فہموں کی کوتاہ نظری:

وہ اہل علم اور دانشور جو قران و حدیث کا سطحی نظر سے مطالعہ کرتے ہیں' اکثر و بیشتر آقائے دوجہاںﷺ کے مقام عبدیت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھانے لگے ہیں۔ قرآن فہمی کے لئے جس بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے فقدان کے باعث آنحضورﷺ کی ذات گرامی ان کے درمیان قیل وقال اور بحث و نزاع کا موجب بن جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں جناب رسالت مآبﷺ کا ذکر دو حوالوں سے آیا ہے۔ ایک حوالہ وہ ہے جس کے پیش نظر حضورﷺ ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے مصداق بلندی اور رفعت کے اس مقام پر نظر آتے ہیں کہ کائنات کی تمام عظمتیں اور رفعتیں ایک ہی نقطے پر مرتکز ہوگئی ہیں جو سید المرسلینﷺ کے مقام محبوبیت کا آئینہ دار ہے جس میں ازل سے ابد تک کوئی آپ کا ہمسر نہیں۔

آنحضورﷺ کی پیغمبرانہ شخصیت کا دوسرا پہلو آپ کا مقام عبدیت ہے جس پر کوتاہ نظر بہک گئے اور اپنی نام نہاد علمیت کی رو میں بہہ کر حضورﷺ کی وسعت علم

کو موضوع بحث بنا لیا اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ نادان اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ حضور ﷺ کی انتہا تک پہنچی ہوئی عبادت گذاری، محویت و استغراق تضرع اور حد سے بڑھی ہوئی گریہ زاری، آپ کی عبدیت کا وہ رخ ہے جس پر آپ خدا کے سراپا شکر و سپاس بندے نظر آتے ہیں لیکن آپ کا حقیقی مقام وہ ہے جس میں آپ محبوب رب العلمین کی حیثیت سے انتہائی ارفع و اعلیٰ مقام پر متمکن ہیں آپ کے اس مقام محبوبیت پر یہ حدیث قدسی دلالت کرتی ہے۔

لو لاک لما خلقت الافلاک۔ اگر آپ ﷺ کو پیدا نہ کیا ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا۔ (کشف الخفا، ۲:۲۱۴)

آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہی وجہ تکوین کائنات ہے اور بقول اقبالؒ

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

حضور ﷺ کے مقام عبدیت اور مقام محبوبیت کی تفہیم ہم سے اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم آپ کے حقیقی مقام کو جو کہ مظہریت حق کا آئینہ دار ہے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور آپ کی شان میں تخفیف کا مرتکب ہو کر اپنے ایمان کو کمزور اور مضمحل نہ بنائیں۔ یہ بات ذہن میں مستحضر کر لی جائے کہ عبدیت اور محبوبیت کے ڈانڈے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور حضور ﷺ عبد کامل ہونے کے ناطے خدا کے محبوب ہیں۔

مقام عبدیت اور عبد کی اقسام:

عبد کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ عبد آبق

۲۔ عبد رقیق

۳۔ عبد ماذون

عبد آبق : اس بھاگے ہوئے غلام کو کہتے ہیں جو اپنے آقا سے دور چلا گیا ہو تمام کفار و مشرکین اس زد میں آتے ہیں۔

عبد رقیق : ایسا غلام جو ہر وقت اپنے آقا کی خدمت گذاری کے لئے کمربستہ رہے عبد رقیق کہلاتا ہے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے سب افراد عبد رقیق کا درجہ رکھتے ہیں۔

عبد ماذون : عبد ماذون اس غلام کو کہتے ہیں جو حلقہ بگوش ہو کر بندگی کے اس درجہ کمال کو پہنچ جائے کہ وہ اپنے سارے اختیارات کی باگ ڈور اپنے مالک کے ہاتھ میں دے دے اور اس کے ہر قول و فعل میں ہمہ وقت اس کے آقا کی رضا شامل ہو۔ عبد ماذون مختلف درجات طے کر کے خدا کے ہاں مقام محبوبیت پر فائز ہو جاتا ہے۔ حضور ختمی مرتبت علی صاحبہا تحیۃ والثناء ماذونیت کے بلند ترین مقام پر ہیں اور آپ ہی کی عبدیت معراج سے سرفراز ہوئی۔

شان عبدیت اور شان محبوبیت کا تقابل

شانِ عبدیت:

سرور کائنات فخر موجودات علی صاحبھا تحیتہ والثنا کی عبادت گزاری بغائت درجہ مجاہدہ و مشقت' خلوتِ شب میں طویل قیام' تسبیح وتہلیل اور نفلی عبادات میں یک گونہ استغراق ومحویت سے عبارت تھی' دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے آپ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے۔ کلام پاک کی تلاوت اتنا طول کھینچتی کہ حضورﷺ کے لئے کھڑے رہنا دوبھر ہو جاتا' جب کثرتِ عبادت کی یہ کیفیت غلبہ و شدت اختیار کر گئی تو اللہ جل مجدہ کے حریم ناز سے جبرائیل امین اس پیغام کے ساتھ آپﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۝ طٰہٰ (اے محبوب مکرم) ہم نے آپ پر قرآن (اسلئے) نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۝ (طٰہٰ' ۲:۲۰)

اس آیہ کریمہ کے مفہوم پر غور کرنے سے حضورﷺ کی ذات گرامی کے دو پہلو اجاگر ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ایک پہلو آپ کی عبدیت اور دوسرا محبوبیت کا ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں واضح طور پر عبدیت کے پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' جس پر فائز ہو کر آپ رضائے خداوندی کے حصول کی خاطر سرتاپا عجز و نیاز کا پیکر اور انکساری و تواضع کا مرقع دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شان بندگی پیہم سوز و ساز' اضطراب والتہاب' گریہ و زاری اور درد و گداز کا نام ہے جس کے بارے میں اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ۔

؎ متاع بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

یہ مقام بندگی بندے کے لئے بے پایاں لذت و حلاوت کا خزینہ اور متاع گراں بہا ہے' یاد

رہے کہ خدا کی ذات اس سے وراء الوراء ہے اور اس کی الوہیت ان چیزوں سے یکسر مستغنی اور بے نیاز ہے۔

کمال عبدیت مصطفویﷺ:

قرآن و حدیث کی روشنی میں جب ہم حضورﷺ کے مقام عبدیت کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو آپ بندگی کے بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ عبادت گزاری، خشوع و خضوع، عاجزی اور تضرع وزاری میں جو درجہ آنحضورﷺ کی ذات گرامی کو حاصل ہے، عالم زیریں و بالا میں موجود کوئی مخلوق اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی، گویا آپ کی عبدیت پر خود عبدیت کو ناز ہے۔ عبدیت کے اس اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہو کر حضورﷺ کثرت عبادت اور مجاہدے میں اس قدر منہمک اور مشغول رہتے تھے کہ کوئی متنفس اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ طویل قیام اللیل کے دوران قدمین شریفین کا متورم ہو جانا، تبلیغ و دعوت دین اور جہاد کے میدان میں دشمنوں کے ہاتھوں جسم اقدس کا لہولہان ہو جانا، فاقہ کشی کرنا، پے در پے صعوبتیں اور تکلیفیں اٹھانا، غاروں میں جا کر رونا اور کثرتِ گریہ وزاری سے ریش مبارک کا آنسوؤں سے تر ہو جانا، حضورﷺ کے کمال عبدیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ آپ کی شان عبدیت کی دلیل ہے نہ کہ شان محبوبیت کی، کون چاہتا ہے کہ اس کے محبوب کو پتھر لگیں اور پھر حضورﷺ تو محبوب ربِ کائنات ٹھہرے، جن کے سر پر تاجِ لولاک لما سجایا گیا اور محبوبیت کے علو مرتبت کا جو مقام آپ کو نصیب ہوا، وہ ابدالاباد تک آپ ہی کا حصہ ہے کہ آپ ہی ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کے مصداق ہیں۔

سرور دوجہاںﷺ کی شان عبدیت اس درجہ کی ہے کہ ساری ساری رات بارگاہ صمدیت میں کھڑے ہو کر مصروف عبادت رہنے کے باوجود عرض پرداز ہوتے۔

ما عبدنک حق عبادتک۔ میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔

اس مقام عبدیت پر فائز ہو کر جہاں آپ کے نعلین پاک سے عرفا و صلحا کو معرفت عطا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت جو حضور نبی اکرمﷺ کو حاصل ہے وہ صرف آپﷺ کا ہی

خاصہ ہے اس کے باوجود آپ ﷺ بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے ۔

ما عرفنک حق معرفتک۔ میں تیری معرفت کا حق ادا نہیں کر سکا۔

یہ شانِ عبدیت جب اپنے کمال پر جلوہ گر ہوئی اور مسلسل مجاہدے اور مشقت سے طبع مبارک پر تھکن اور درماندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تو حضرت جبرائیل کے ذریعے کہلوا دیا کہ اے محبوب اپنی جانِ عزیز پر اتنی مشقت کا بارِ گراں نہ اٹھایئے۔

شانِ عبدیت پر ایک تمثیل:

اوپر درج کردہ آیہ کریمہ میں حضور ﷺ کی ذات گرامی کے جن دو پہلوؤں کا اجمالاً ذکر ہوا انہیں ایک عام فہم مثال کے ذریعے باسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض کیجئے شفیق اور جان چھڑکنے والے ماں باپ کا بیٹا سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے رات گئے تک جاگتا ہے' جب بھی ان کی آنکھ کھلتی ہے اور وہ اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ تیاری میں مصروف دیکھتے ہیں تو سمجھانے کے انداز میں کہتے ہیں "بیٹا اب کچھ سو لے' مبادا اتنی دیر تک جاگنا خرابی صحت کا موجب بن جائے''۔ بیٹے کے سامنے ایک مقصد ہے جسے وہ رات دیر تک جاگنے کے جواز کے طور پر پیش کرتا ہے' لیکن ماں باپ بوجوہ محبت کے تقاضوں کے مجبور ہو کر بیٹے کی صحت و سلامتی کے لئے فکرمند رہتے ہیں۔

بلاتمثیل ذاتِ خداوندی ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت کے تصور سے بدرجہا بلند ہے' جب حضور ﷺ عبدیت کے تقاضوں کو کما حقہ بجا لانے کے لئے بارگاہ خداوندی میں مصروف عبادت ہوتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ رات کی ساعتیں پھیل کر دامن قیامت تک دراز ہو جائیں لیکن باری تعالیٰ کی ذات چاہتی ہے کہ اس کا محبوب رات کا کچھ حصہ آرام بھی کر لے۔

یہ نکتۂ محبت ذہن میں راسخ کرنا ازبس ضروری ہے کیونکہ روح اسلام اور معرفتِ دین سے بے بہرہ ہمارے نام نہاد مبلغ (الا ماشاء اللہ) اکثر و بیشتر اس نکتہ محبت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں اور وہ دین

اسلام کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو خشک اور جذبہ محبت سے عاری ہوتی ہے۔

حضورﷺ کی ذات مبارکہ کے حوالے سے قرآن و حدیث کا مطالعہ اس نکتے کو اجاگر کرتا ہے کہ اگر ایک طرف سرکار دو جہاںﷺ کی شان عبدیت کا تقاضا ہے کہ آپ بارگاہ ایزدی میں عاجزی تواضع اور گریہ و زاری کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے جھکتے چلے جاتے ہیں تو دوسری طرف آپ کی شان محبوبیت اس بات کی متقاضی ہے کہ باری تعالٰی آپ کو جملہ خلائق میں اٹھاتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آپ بلندیوں اور رفعتوں کے مقام منتہا پر دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ میں آ جائے تو نور و بشر کے سارے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بصیرت اور سوجھ بوجھ ہر کسی کو کہاں میسر آ سکتی ہے۔ بقول شاعر

؎ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اس نکتے کی تفہیم صرف اسی وقت ممکن ہے جب کوئی جہالت اور نادانی کی پٹی اپنی آنکھوں سے اتار پھینکے۔

شان محبوبیت:

سرور کائناتﷺ کی شان محبوبیت پوچھنا ہو تو خالق کائنات سے پوچھئے۔ قرآن کریم کے آئینے میں جھانک کر دیکھیں تو دیکھنے والی آنکھ کو کئی مقامات پر حضورﷺ کا مقام محبوبی عیاں نظر آئے گا ارشاد ربانی ہے۔

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِO وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِO

میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں (اے حبیب مکرم) اس لئے کہ آپ اس شہر میں تشریف فرمائیں o

(البلد، ۹۰:۱۔۲)

آیہ کریمہ میں شہر محبوب (مکۃ المکرّمہ) کی قسم اسی نکتہ محبت کے باب میں کھائی جا رہی ہے

رب العزت ارشاد فرماتے ہیں کہ اس شہر بے مثال کی قسم میں اس لئے نہیں کھاتا کہ یہاں میرا گھر ہے۔ صفا و مروہ، حجر اسود اور مقام ابراہیم ہے، حالانکہ یہ سب نسبتیں اپنی جگہ عزت و تکریم کی مستحق ہیں، لیکن ''خوش تر آں شہرے کہ آنجا دلبراست'' کے مصداق یہ شہر اس لئے قسم کھانے کے لائق ہے کہ وہاں میرے محبوب کے تلوے لگے ہیں اور اس کے گلی کوچوں میں وہ محوِ خرام ناز ہوتا ہے۔

شان عبدیت اور شان محبوبیت ۔ زاویہ نگاہ کا فرق:

رسول مکرم ﷺ کی شان عبدیت اور شان محبوبیت آپ کی شخصیت مقدسہ کے دو رخ ہیں۔

جب مقام عبدیت درپیش ہوتا ہے تو حضور ﷺ اپنے تمام کمالات کی نفی کرتے ہوئے خود کو بارگاہ رب العزت میں جھکاتے ہیں اور ہر کمال کو اپنے مولا کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس کے باوصف جب خدا کو اپنے محبوب کی شان محبوبیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو وہ انہیں بلندیوں اور رفعتوں سے نوازتا ہے جہاں تک رسائی کسی فرد کے بس میں نہیں۔

یہ دو مختلف زاویہ نگاہ ہیں کہ جب حضور ﷺ سے ان کے علم کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو مقام عبدیت پر وہ علم کو خدا کی ذات سے منسوب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا، علیم وخبیر ذات فقط اللہ تعالیٰ کی ہے۔ جب یہی سوال باری تعالیٰ سے کیا جاتا ہے تو اپنے محبوب کے علم کے بارے میں قرآن حکیم کے الفاظ میں جواب یوں مرحمت ہوتا ہے۔

وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًاO (النساء، ۴:۱۱۳)	اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا کر دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہےO

مقام عبدیت پر حضور ﷺ اپنے آپ کو پیکرِ عجز و نیاز اور ادنی و بے کس بندہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور مقام محبوبیت پر خدا آپ کی ذات گرامی کو کبھی 'رحمتہ للعلمین'، کبھی 'شاھدا و مبشرا و نذیرا' اور کبھی 'داعیا الی اللہ' کہہ کر متعارف کراتا ہے اور کہیں 'سراج منیرا' عزیز علیہ ماعنتم'

اور رئوف الرحیم جیسے توصیفی کلمات سے روشناس کراتے ہوئے اپنی ساری نعمتیں اپنے محبوب کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا ضروری و لابدی ہے کہ مقام عبدیت پر جو کچھ آنحضورﷺ اپنی ذات ستودہ صفات کی طرف منسوب فرماتے ہیں وہ فقط آپ کا حق ہے اور کسی کے لئے روا نہیں کہ وہ چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق انہی کلمات کو اپنی زبان پر لائے جو آپﷺ نے اپنی نسبت اظہار بندگی کے طور پر ادا فرمائے تھے، یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ وہ مقام عبدیت پر حضورﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے کلمات کے پیمانے پر آپ کے مقام و مرتبہ کو ناپنے لگے۔ مقام بندگی کے مظہر کلمات عجز و نیاز کی بنیاد پر حضورﷺ کی پیغمبرانہ عظمت کا تعین کرنا اہل ایمان کا حق نہیں بلکہ ان کا شیوہ تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ جناب رسالت مآبﷺ کا ذکر باری تعالٰی کے تتبع میں، رحمتہ للعلمین، حامل فضل عظیم، صاحب خلق عظیم اور صاحب حق مبین جیسے قرآن حکیم میں فرمائے ہوئے القابات توصیفی انداز میں بیان کرے۔

شان محبوبیت ۔ حدیث مبارکہ کی روشنی میں:

یہاں ہم آقائے دو جہاںﷺ کے چند ارشادات گرامی درج کریں گے تاکہ آپ کی شان محبوبیت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

۱۔ انما انا قاسم و اللہ یعطی۔ بے شک میں تقسیم کرتا ہوں اور اللہ مجھے عطا کرتا ہے۔

صحیح البخاری، ۱:۱۶ کتاب العلم باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین، رقم: ۷۱

۲۔ الکرامت و المفاتیح یومئذ بیدی۔ اس قیامت کے روز کرامت اور تمام خزانوں کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی۔

۱۔ مشکوۃ المصابیح: ۵۱۴

۲۔ شرح السنہ، ۱۳: ۲۰۳

۳۔انا قائد المرسلین ولا فخر' و انا خاتم النبیین ولا فخر' و انا شافع واول مشفع ولا فخر۔
(سنن الدارمی'۱:۳۱)

میں تمام نبیوں کا قائد ہوں لیکن کوئی فخر نہیں ہے' میں خاتم النبیین ہوں اور کوئی فخر نہیں ہے' میں شفاعت کرنے والا ہوں اور میری شفاعت قبول ہونے والی ہے لیکن کوئی فخر نہیں۔

۴۔ أنا أول الناس خروجا إذا بعثوا و أنا قائدهم إذا وفدوا ، و أنا خطیبهم إذا انصتوا، وأنا مشفعهم إذا حبسوا، و أنا مبشرهم إذا أیسوا، الکرامة والمفاتیح یومئذ بیدی ، ولواء الحمد یومئذ بیدی و أنا أکرم ولد أدم علی ربی، یطوف علی ألف خادم کأنهم بیض مکنون أولؤلو منثور۔

روزِ محشر مجھے تمام لوگوں سے پہلے اٹھایا جائے گا اور میں تمام لوگوں کے وفود کا قائد ہوں گا اور جب سب خاموش ہوں گے تو میں ان کا خطیب ہوں گا اور جب وہ مشکل میں پھنسے ہوں گے میں ان کی شفاعت کروں گا اور جب وہ نا امید ہوں گے میں انہیں بشارت دوں گا۔ تمام کرامتیں اور (خدائی خزانوں) کی چابیاں اس دن میرے ہاتھ میں ہوں گی۔ لوائے حمد اس دن میرے ہاتھ میں ہوگا' مجھے میرے رب کی قسم! میں بنی آدم میں سے افضل پیدا کیا گیا ہوں اور میرے اردگرد ایک ہزار خدام طواف کرتے ہوں گے وہ ایسے ہوں گے جیسے سفید موتی یا چمکتے ہوئے درِ منثور۔

۱۔سنن الدارمی'۱:۳۰

۲۔ الجامع الترمذی'۵:۵۸۵' کتاب المناقب باب فی فضل النبی ﷺ' رقم:۳۶۱۰

۵ ۔أعلٰی درجة فی الجنة لا ینالها الّا رجل واحد و أرجوأن أکون أنا هو ۔	جنت میں ایک ایسا اعلیٰ مقام ہے جہاں کسی کی رسائی نہ ہوگی مگر ایک ہستی کی اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ میں ہوں گا۔

۱۔مشکوۃ المصابیح:۵۱۴

۲۔ الجامع الترمذی، ۵:۵۸۷ کتاب المناقب، باب فی فضل النبی ﷺ:۳۶۱۴

٦ ۔إذا کان یوم القیامة کنت امام النبیین و خطیبهم و صاحب شفاعتهم غیر فخر ۔	جب قیامت کا دن آئے گا تو میں نبیوں کا امام، ان کا خطیب اور ان کی شفاعت کروں گا بغیر فخر کے۔

۱۔الجامع الترمذی، ۵:۵۸٦ کتاب المناقب، باب فی فضل النبی ﷺ، رقم:۳٦۱۳

شان عبدیت کے علی الرغم حضور ﷺ کے ارشاد مبارکہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے کہ جب آپ ﷺ شان محبوبیت میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو خدا کی ذات آپ کو کمالات کی بلندیوں کی انتہا سے ہمکنار کرنے لگتی ہے، یہاں تک کہ آپ کے مقام کی عظمت و رفعت کا اندازہ لگانا بھی کسی فرد بشر کے بس کی بات نہیں۔ گویا شان محبوبیت میں خدا اپنے محبوب کو بلند سے بلند تر مقامات عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب کہ شان عبدیت میں حضور علیہ السلام خود کو بغائت درجہ جھکا جھکا کر عجز و نیاز کا پیکراتم بنا کر پیش کرتے ہیں۔

شان محبوبیت اور شان عبدیت کا باہمی تعلق:

خالق کائنات نے چند در چند حکمتوں کی بنا پر اپنے محبوب میں عبدیت اور محبوبیت کی دونوں

شانیں یکجا جمع فرما دیں۔ ان کی اہمیت اور باہمی ربط وتعلق (Relevance) کو سمجھ لینا ازبس ضروری ہے۔ حضورﷺ کو شان محبوبیت سے اس لئے نوازا گیا کہ ہم دنیا دار انسان آپ کی حیثیت وعظمت کو سمجھ کر اپنے عقائد درست کرسکیں، جبکہ شان عبدیت آپ کو اس لئے عطا ہوئی کہ ہم اپنے اخلاق و اعمال کی اصلاح کر کے اپنی زندگیوں کو سنوار لیں۔ محبوبیت اور عبدیت کی یہ دونوں شانیں بحیثیت مجموع حضورﷺ کی سیرت مبارکہ کو تشکیل دیتی ہیں۔

شان محبوبیت اور شان عبدیت کے باب میں آخری نکتہ سمجھ لینے سے وہ سارے جھگڑے اور تنازعے ختم ہو سکتے ہیں جو بدقسمتی سے نادانی و جہالت کی بنا پر امت مسلمہ میں پیدا ہو گئے ہیں۔ صوفیا اور اہل طریقت کے ہاں عروج اور نزول کی دو اصطلاحیں مروج ہیں۔ عروج وہ مقام ہے جو اللہ کا برگزیدہ بندہ درجہ بہ درجہ کمالات طے کر کے حاصل کرتا ہے جبکہ نزول وہ مقام ہے جہاں بندۂ خدا اپنے کمالات کی بلندیوں سے نیچے اتر کر عام انسانوں کی سطح پر آ جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا انتہائی ضروری ہے کہ کوئی بھی خدا کا بندہ اس وقت تک اپنی شخصیت میں کامل نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنی ذات کو عروج اور نزول کے اوصاف سے متصف نہ کرلے۔ ان اوصاف کو کردار وعمل میں متحقق کئے بغیر انسانی شخصیت ہمہ وجوہ نامکمل اور ادھوری رہتی ہے۔

شان محبوبیت اور شان عبدیت کی وضاحت ایک تمثیل کے ذریعے:

آنحضورﷺ کی محبوبیت اور عبدیت کے باب میں عروج اور نزول کے تصور کی تفہیم ایک عام مثال کے ذریعے بخوبی ہوسکتی ہے۔

اپنی روزمرہ زندگی میں کوئی غریب اور مفلوک الحال کسی بڑے امیر وکبیر اور صاحب جاہ و منصب آدمی کے پاس جاتا ہے، وہ شخص اسے مل کر جب واپس آتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ تم نے اس بڑے آدمی کو اپنے اطوار و کردار میں کیسا پایا؟ وہ کہتا ہے کہ اس بڑے آدمی نے میری بات تو سنی اور جس

کام سے میں اس کے پاس گیا تھا وہ بھی کر دیا لیکن مجھے دیکھتے ہی وہ چیں بہ چیں ہوگیا اوراس کا میرے ساتھ ملنا انتہائی روکھے پن اور تکبر و رعونت کا انداز لئے ہوئے تھا' اسے مل کر میرا یہ احساس پختہ ہو گیا ہے کہ وہ بڑا آدمی اپنے جاہ ومنصب کے گھمنڈ میں ہم عامیوں کی قربت اور معیت کو یکسر پسند نہیں کرتا۔

اس کے برعکس وہی غریب آدمی اس سے بھی بڑے ایک آدمی کے پاس اپنی کسی حاجت کے سلسلے میں ملنے جاتا ہے' جب وہ لوٹتا ہے تو لوگوں کے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ اس بڑے آدمی نے تو میرا دل جیت لیا ہے۔ مجھے ملتے ہی اس نے خندہ پیشانی سے بیٹھنے کے لئے کہا' چائے اور دیگر لوازمات سے میری تواضع کی' انتہائی دلچسپی سے میری بات سنی اور جس کام کے لئے میں گیا تھا وہ بھی کر دیا اور یہ بھی کہا کہ آئندہ جب بھی ضرورت پڑے بلاتکلف میرے پاس آ جایا کرو' سچ پوچھئے اس بڑے آدمی نے ذرہ بھر اپنی بڑائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

اس غریب آدمی سے ملنے والا پہلا شخص عروج اور دوسرا نزول کے درجے پر تھا۔ یہ تمثیل سرورکائناتﷺ کے مقام محبوبیت اور مقام عبدیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ حضورﷺ کی حقیقی عظمت شانِ محبوبیت کی آئینہ دار ہے۔ اس مقام پر آپ لامکاں کی بلندیوں اور قاب وقوسین کی رفعتوں پر سرفراز نظر آتے ہیں۔ جبکہ اپنی شان عبدیت میں آپ مجسم خلق عظیم اور تواضع و انکساری کا پیکر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دونوں شانیں پہلو بہ پہلو آپ کی شخصیت مبارکہ کا جزو لاینفک ہیں۔

باب سوم

حقیقت رسالت محمدی ﷺ

پچھلے باب میں عبد کے تین درجوں کا اجمالاً ذکر ہوا۔ ان میں مقرب الٰہی ہونے کی بنا پر عبدِ ماذون مقام محبوبیت پر فائز ہے۔ ایک عام انسان اور عبدِ ماذون میں یہ بنیادی فرق ہوتا ہے کہ اول الذکر نفس اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر بغاوت اور سرکشی کی راہ پر چل نکلتا ہے اور اسے قربِ خداوندی سے محروم کر دیا جاتا ہے جبکہ آخر الذکر خدا کے قرب خاص کی بنا پر بے پایاں انعامات و نوازشات کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ عبدِ ماذون عالمِ رنگ و بو کی رعنائیوں اور دلکشیوں میں کھو کر نہیں رہ جاتا' بلکہ اس کا مدعا اور منتہائے مقصود محبوب حقیقی کی رضا اور خوشنودی ہوتا ہے جس کے حصول کے پیش نظر وہ قدم قدم پر بچھے ہوئے حرص و آز کے دام سے سالم و محفوظ گزر جاتا ہے۔ اس کی تمام تر زندگی اطاعت و حلقہ بگوشی سے عبارت ہوتی ہے جس کے صلے میں وہ بندگی میں اتنا پختہ اور یگانہ ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مشیت ایزدی کا ترجمان ہوتا ہے اور بقول مولائے رومؒ

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

عبدیت کاملہ کے مدراج:

ایک عام انسان کی عبدیت ناقص و نامکمل رہتی ہے لیکن درجہ ماذونیت پر

فائز ہو کر بتدریج ارتقاء کے نتیجے میں بندہ مقام محبوبیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جس کے آگے عبدیت کاملہ کی منزل آتی ہے۔ عبدیت کاملہ کے دو مدارج ہوتے ہیں جس کے اعلیٰ درجے پر تمام حضرات انبیاء فائز ہوتے ہیں جبکہ ادنیٰ درجے میں حفظ مراتب کے لحاظ سے اولیائے کرام اور صلحائے امت شامل ہیں۔ اس مقام تک رسائی میں مجاہدے اور مشقت و ریاضت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے لیکن جہاں تک عبدیت کاملہ کے اعلیٰ و ارفع مقام کا تعلق ہے یہ بات ذہن رہے کہ یہ منزل اکتسابی نہیں کہ جس تک رسائی ہرکس و ناکس کو مجاہدہ و ریاضت کے ذریعے نصیب ہو سکے بلکہ یہ سراسر عطیہ خداوندی اور انعام الٰہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ جسے چاہیں وہبی طور پر نبوت و رسالت کے بلند منصب کے لئے منتخب فرما لیں چنانچہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں علی صاحبہا تحیۃ والثناء تک انبیاء کرام کا سلسلہ بنی نوع انسان کی رشد و ہدایت کے لئے من جانب اللہ مامور رہا اور ہمارے آقا و مولا ﷺ کی بعثت کے بعد نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ یہ تمام نفوس قدسیہ عبدیت کاملہ کے مقام رفیع سے سرفراز ہوئے۔

مقام رسالت کے مدارج:

اولیاء و صلحا اور بندگان حق کی طرح انبیاء و رسل کے بھی اپنے اپنے درجے ہیں جن کا تعین خالصتہً من جانب اللہ ہوتا ہے۔ ان فرستادگان بارگاہ حق میں حضرت سلیمان جیسے جلیل القدر اور صاحب عظمت و دبدبہ نبی بھی تھے جو زندگی بھر رضائے الٰہی کے حصول کے لئے مصروف جدوجہد رہتے ہوئے اپنی دعاؤں میں قرآن حکیم کے الفاظ میں اس بات کی آرزو اور جستجو کرتے رہے۔

اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَO (النمل، ۲۷:۱۹)	اور میں ایسے نیک عمل کرتا رہوں جن سے تو راضی ہوتا ہے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے خاص قرب والے نیکوکار بندوں میں داخل فرمائےO

منصب رسالت سے سرفراز ہونے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے صاحب جبروت نبی اعمال صالحہ کی توفیق اس لئے طلب کرتے رہے کہ انہیں خدا کی رضا حاصل ہو جائے، اس رضائے الٰہی کے حصول کے لئے انہوں نے زندگی بھر جہد مسلسل کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

لیکن رسالت و نبوت کا ایک ایسا درجہ اور مقام بھی ہے جس پر فائز ہوکر محبوبیت کا وہ مقام نصیب ہوتا ہے جہاں بندہ محبوب کے طلب گار رضائے خداوندی ہونے کی بجائے خدا خود اس کی رضا کا طالب بن جاتا ہے۔ یہ ارفع اور بلند ترین مقام تمام کائنات میں ابتدائے آفرینش سے تا ابدالاباد صرف امام المرسلین اور آقائے دوجہاں ﷺ کے حصے میں آیا جن کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰیO (الضحیٰ، ۹۳:۵)	اور آپ کا رب عنقریب آپ کو (اتنا کچھ) عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

یہ مقام محبوبیت وہ مقام ہے جہاں محبّ و محبوب کی رضا ایک ہو جاتی ہے۔ محبوبیت میں کمال اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ محبوب کا ہر عمل مشیت ایزدی کے سانچے میں ڈھل جائے اور دونوں کی رضا کامل ہم آہنگی اور مطابقت اختیار کر جائے۔

تحویل کعبہ۔ مقام رضا کا مظہر:

مقام محبوبیت پر فائز انبیاء میں بعض متلاشیان رضائے حق وہ بھی تھے جو خدا کا گھر تعمیر کرنے کے لئے معمارِ کعبہ بنے لیکن وہ جن کے لئے محبوبیت کا بلند ترین مقام مختص تھا اس جگہ کو جدھر ان کی نگاہیں مشتاقانہ اٹھ گئیں ابدالاباد کے لئے قبلہ بنا دیا گیا۔

ہجرت سے قبل حضورﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ مکتہ المکرّمہ میں کعبہ کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کرتے تھے۔ مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد حکم خداوندی کی تعمیل میں مسلمان بیت المقدس کی سمت رخ کر کے نمازیں پڑھنے لگے اور یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں آنحضورﷺ کے قلب انور میں یہ آرزو کروٹ لینے لگی کہ بیت المقدس کی بجائے کعبتہ اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنا دیا جائے۔ اس آرزو کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حضورﷺ بار بار آسمان کی طرف وحی الٰہی کے انتظار میں اشتیاق بھری نظروں سے تک رہے تھے کہ جبرائیل امین اس پیغام حق کے ساتھ بارگاہ مصطفویﷺ میں حاضر ہوئے۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِکَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّکَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا۔ (البقرة، ۲:۱۴۴)

(اے حبیب!) ہم بار بار آپ کے رخ انور کا آسمان کی طرف پلٹنا دیکھ رہے ہیں سو ہم ضرور بالضرور آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔

حضورﷺ کا اپنی چشمان مقدس سے آسمان کی جانب نگاہ کرنا قبلہ کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن گیا اور اس تحویل قبلہ کا حکم بارگاہ خداوندی سے فقط اس لئے نازل ہوا کہ محبوب کی رضا یہی تھی گویا یہ وہ نقطہ کمال تھا جہاں محبوبیت اور مقربیت

باہم متصل ہوگئیں اور محبّ و محبوب کی رضا ایک دوسرے میں ڈھل گئی۔

تاہم یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ باوجود اتنے بلند ترین مقام محبوبیت پر فائز ہونے کے جہاں ارض و سما کے خزانوں کی کنجیاں حضورﷺ کے ہاتھوں میں دے دی گئیں اور آپ تاجدار ھَل اَتٰی اور دنیا و آخرت کی نعمتوں کے قاسم قرار پائے' آپ اپنے مقام عبدیت سے سرمو نیچے نہ آئے بلکہ رفیع الدرجات ہونے کے باوصف آپ کا مقام عبدیت اور احساس بندگی بدرجہا اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اسی بنا پر حضورﷺ اپنے رب کی بارگاہ میں کھڑے کمال خشوع و خضوع اور عجز و نیاز کا پیکرِ اتم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ ذات جس کے آگے آپ حاضر ہیں حضورﷺ کی طالب بھی ہے اور مطلوب بھی' گویا اس نقطہ کمال پر عبد کامل اور معبود حقیقی کے مابین ایک ایسا لطیف اور وجد انگیز تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ خدا کی ذات اپنے کامل بندے کی اور بندہ کامل اپنے رب کی رضا کا متلاشی رہتا ہے۔ محبوبیت کا یہ کمال عبادت گزاری سے نصیب ہوتا ہے اور اس کیفیت میں شدت بلند تر درجات کی حامل بن جاتی ہے۔

حضورﷺ کو اپنی ذات پر قیاس کرنا متاع ایمان کو غارت کر دیتا ہے:

یہ بات ذہن نشین رہے کہ کسی امتی کو حق نہیں پہنچتا کہ سید عالمﷺ کے غایت درجہ عجز و نیاز' تواضع و انکسار اور خشوع و خضوع کے پیش نظر آپ کے مقامِ رسالت کا تعین کرنے لگے اور آپﷺ کے مظاہر بندگی سے دھوکا کھا کر آپ کے معیار رسالت کو ایک عام بشر کے درجے پر لے آئے۔ حضورﷺ کے بارے میں ایسے سطحی اور کمتر خیالات کو دل میں جگہ دینا متاع ایمان کو غارت کر کے رکھ دیتا ہے۔

آنحضور ﷺ کے مقام عبدیت کو ایک سادہ فہم مثال سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی باپ اپنے باشعور بالغ بچوں کے سامنے اپنے بوڑھے والد بزرگوار کی خدمت میں انتہائی مودب اور متواضع انداز اختیار کیئے رہتا ہے' اس کے پاؤں دباتا ہے' جوتے سیدھے کرتا ہے اور اس کی خدمت گزاری اور ناز برداری میں کوئی کسر اٹھائے نہیں رکھتا تو کیا اس کے بچوں کے لئے اپنے باپ کو خادم کا درجہ دینا روا ہو گا؟ اگر بچوں کی تربیت صحیح نہج پر ہوئی ہے تو وہ اپنے باپ کی اس تواضع اور خدمت گذاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے لائق تقلید سمجھیں گے اسی طرح ایک استاد کا اپنے شاگردوں کے سامنے اپنے سن رسیدہ استاد کی خدمت اور تعظیم و تکریم کرنا 'ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد' کے مصداق ان کے دل میں استاد کی قدر و منزلت بڑھانے اور استاد کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا کرے گا۔ اسی تمثیل سے حضرات انبیاء اور آقائے نامدار ﷺ کی عبادت گزاری اور اظہار عجز و نیاز کو دیکھ کر کسی امتی کا ان کی شان کے منافی سوء ادب کے کلمات زباں پر لانا اس کے ایمان کو خطرے میں ڈال دے گا۔

بندگان خدا عبدیت کے ارتقائی مدارج طے کر کے جب کمال حاصل کرتے ہیں تو انہیں مقام شکر تک رسائی نصیب ہوتی ہے جس پر انہیں بارگاہ ایزدی سے یہ مژدۂ جاں فزا سنایا جاتا ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ۔ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم پر (نعمتوں میں) ضرور اضافہ کروں گا۔

(ابرہیم' ۱۴:۷)

گویا سپاس و تشکر بجا لانا عنایات خداوندی کے مزید در کھول دینے کا موجب بنتا ہے۔ اس قول خداوندی کی تائید ایک حدیث مبارکہ سے بھی ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

وما تواضع احد لله الا رفعه اللّٰه۔ جو اللہ کے لئے (تضرع وزاری اور) تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس (کے مراتب) کو بلند کر دیتا ہے۔

۱۔ صحیح لمسلم، ۲:۳۲۱، کتاب البروالصلۃ و لآداب، باب استحباب العفور والتواقع، رقم:۶۹

۲۔ الجامع الترمذی، ۴: ۳۷۶، کتاب البروالصلۃ، باب ما جاء فی التواضع، رقم:۲۰۲۹

۳۔ مسند احمد بن حنبل، ۲:۳۸۶

آنحضورﷺ کے اس قول مبارکہ سے مترشح ہے کہ بندہ جوں جوں بارگہ خداوندی میں جھکتا چلا جاتا ہے توں توں اس کے درجان بلند سے بلند تر کر دیئے جاتے ہیں۔

ذکر مصطفیٰ ﷺ ہر چیز سے بلند تر ہے:

خالق کائنات نے اپنے حبیب لبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خلق عظیم عجز و انکسار اور مقام عبدیت میں درجہ کمال تک پہنچنے کے باعث آپ کے ذکر کو حسب ارشاد قرآنی دنیا کی ہر چیز پر بلندی و رفعت کا مورد ٹھہرایا۔

وَ رَفَعۡنَالَکَ ذِکۡرَکَ O اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو بلند کر دیاo

(الانشرح، ۹۴، ۴)

اس ارشاد خداوندی کی توضیح اور تصدیق و تائید ایک حدیث مبارکہ کے مضمون سے بخوبی ہو جاتی ہے جس میں حضورﷺ نے حضرت جرائیل سے استفسار فرمایا کہ خدا کے ہاں میرے ذکر کا بلند ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ جرائیل امین نے جواب میں عرض کیا کہ اس سے منشائے خداوندی یہ ہے۔

اذا ذکرت ذکرت معی۔ جب میرا ذکر ہو گا تو آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ہو گا۔

(تفسیر ابن کثیر، ۴:۵۲۴)

باری تعالیٰ کا ارشاد اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اے محبوب ﷺ مجھے ہرگز گوارا نہیں کہ کسی جگہ میرا ذکر ہو رہا ہو اور آپ کا ذکر وہاں نہ ہو۔ گویا اللہ رب العزت نے اپنے ذکر کی قبولیت کی لازمی شرط یہ رکھی ہے کہ اس کے حبیب ﷺ کے ذکر کو کبھی اس کے ذکر سے جدا نہ کیا جائے۔ بصورت دیگر وہ ذکر شرف پذیرائی سے محروم ہو گا اور ایسا کرنے والے کا عمل اللہ کی بارگاہ صمدیت میں مقبول نہیں ہو گا۔

حلقہ بگوشی مصطفیٰ ﷺ ۔ محبوبیت کا پہلا زینہ:

اگر کوئی بندہ خدا کا محبوب بننا چاہتا ہے تو اس کے لئے اطاعت و اتباع مصطفوی ﷺ اختیار کرنا اولین شرط ہے مقام محبوبیت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے حضور ﷺ کی حلقہ بگوشی میں آنا لازمی و لابدی ٹھہرایا گیا جیسا کہ قران حکیم میں بصراحت ارشاد فرمایا گیا۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (آل عمران‘ ۳:۳۱)	(اے حبیب!) آپ فرما دیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔

اس آیہ مبارکہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ حضور ﷺ کی اتباع و اطاعت کے بغیر خدا کی اطاعت اور محبت کا دعوی کرنا محض خام خیالی ہے۔ خدا اور محبوبِ خدا کی محبت و اطاعت لازم و ملزوم ہے‘ گویا عبدیت کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن نے وہ تمام امتیازات یکسر مٹا دیئے جن سے خدا اور رسول کے درمیان دوئی یا مغایرت کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

خدا ور مصطفیٰ ﷺ کے باہمی تعلق پر قرآنی ارشادات:

قرآن حکیم میں ایسے مقامات بے شمار ہیں جن میں ایمان‘ اطاعت اور

محبت کے باب میں باری تعالیٰ نے اپنا اور اپنے محبوب ﷺ کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔ اس ضمن میں بعض ارشادات خداوندی کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ۔ (الحجرات۴۹:۱۵)	کامل ایماندار تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اللہ پر اور اس کے رسول پر۔
۲۔وَ اَطِیْعُو اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗٓ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ O (الانفال۸:۱)	اوراللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کیا کرو اگرتم ایمان والے ہوO
۳۔وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا۔ (النساء۴:۱۴)	اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اوراسکی حدود سے تجاوز کرے اسے وہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔
۴۔وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِO (الانفال۸:۱۳)	اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ(اسے) سخت عذاب دینے والا ہےO
۵۔اَلَمْ یَعْلَمُوْا اَنَّہٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاَنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ۔ (التوبہ۹:۶۳)	کیا وہ نہیں جانتے کہ جو شخص اللہ اور اسکے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اسکے لئے دوزخ کی آگ (مقرر) ہے۔
۶۔وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ۔ (التوبہ۹:۲۹)	اور نہ ان چیزوں کو حرام جانتے ہیں جنہیں اللہ اور اسکے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔

۷۔اِنَّمَا جَزآؤُ الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ۔
(المائدہ ۵:۳۳)

بے شک جو لوگ اللہ اور اسکے رسول سے جنگ کرتے ہیں اسکی سزا یہی ہے۔

۸۔وَلَوْ اَنَّھُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ۔
(التوبہ۹:۵۹)

اور کیا ہی اچھا ہوتا وہ لوگ اس پر راضی ہو جاتے جو ان کو اللہ اور اسکے رسول نے عطا فرمایا تھا اورکہتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے۔

۹۔وَمَا نَقَمُوْا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰھُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ مِنْ فَضْلِہٖ۔
(التوبہ۹:۷۴)

اور وہ (اسلام اور رسول کے عمل میں) کسی چیز کو نا پسند نہ کرسکے سوائے اسکے کہ انہیں اللہ اور اسکے رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا تھا۔

۱۰۔سَیُؤْتِیْنَا اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَرَسُوْلُہٗ۔ (توبہ۹:۵۹)

عنقریب ہمیں اللہ اپنے فضل سے اور اسکا رسول (مزید) عطا فرمائے گا۔

۱۱۔وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ۔
(التوبہ۹:۳)

(یہ آیات) اللہ اور اسکے رسول کی جانب سے اعلان ہے۔

۱۲۔بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ۔
(التوبہ۹:۱)

اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے بیزاری (و دست برداری) کا اعلان ہے

۱۳۔فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔
(النساء۴:۵۹)

پھر اگر کسی مسئلہ میں تم باہم اختلاف کرو تو اسے (حتمی فیصلہ کے لئے) اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

۱۴۔اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِ۔ (الاحزاب، ۳۳:۳۷)	جس پر اللہ نے احسان فرمایا ہے محبوب! آپ نے بھی اس پر احسان کیا۔
۱۵۔وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ۔ (الاحزاب، ۳۳:۳۶)	اور نہ کسی مومن مرد اور نہ کسی مومن عورت کو حق پہنچتا ہے کہ جب اللہ اور رسول کچھ حکم فرما دیں تو انہیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے۔

کوئی عملِ خیر نسبت مصطفوی ﷺ کے بغیر مقبول نہیں:

متذکرہ بالا تمام قرآنی ارشادات میں اللہ رب العزت نے اپنا اور اپنے محبوب کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے حالانکہ ہر مقام پر نسبت کسی ایک کے ساتھ بھی ہو سکتی تھی۔ دونوں کو یکجا کرنے سے باری تعالیٰ لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور راسخ کرنا چاہتے ہیں کہ میرے محبوب ﷺ کو درمیان میں لائے بغیر کوئی عمل اور کوئی سعی مقبول نہیں ہو سکتی۔ خدا کو تو یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ عمل جس کی نسبت براہ راست اس کی ذات سے ہے جیسے قربانی، جو خالصتہً خدا کے لئے دی جاتی ہے اس کے حبیب ﷺ کی مسابقت میں کیا جائے۔ روایات میں ہے کہ ایک دفعہ بعض صحابہؓ نے اپنی قربانی کا جانور آقائے نامدار ﷺ سے پہلے ذبح کر لیا ان کے یہ عمل بارگاہ خداوندی میں ناپسندیدہ ٹھہرا اور انہیں جملہ اہل ایمان کے ساتھ قرآن حکیم کے ذریعے یہ وعید سنائی گئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَيۡنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ۔ (الحجرات، ۴۹:۱)	اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔

اس آیہ کریمہ میں ان اہل ایمان کو جنہوں نے یہ عمل خیر (قربانی) نادانستہ حضور ﷺ سے پہلے سرانجام دیا' متنبہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ تمہارا قربانی کرنے کا عمل خالصۃً اللہ کے لئے ہے اور خدا کا رسول بھی اسی کے لئے قربانی کرتا ہے لیکن جان لو کہ تمہارا یہ عمل رائیگاں گیا کیوں کہ کسی معاملہ میں خدا اور رسول سے پہل کرنا شرف قبولیت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا' چنانچہ ان اصحاب رسول ﷺ کو دوبارہ قربانی دینے کا حکم ہوا۔

آقائے دوجہاں ﷺ کے ذکر کو خدا کے ذکر کے ساتھ جو نسبت تھی اس کا صحابہ کرامؓ کو پورا ادراک تھا ان کا یہ معمول تھا کہ جب کبھی وہ ذکر خدا کرتے تو ذکر رسول کو اس سے جدا نہ کرتے۔ وہ حضور ﷺ کے مقام محبوبیت سے کما حقہ آشنا تھے کہ خدا کے بعد بزرگی و یکتائی میں کوئی آپ کا شریک و ہمسر نہیں۔ آثار صحابہؓ سے اس امر کی تواتر کے ساتھ تائید ملتی ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں اپنا سارا مال و منال لے کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوگئے تو حضور ﷺ نے اپنے اس جانثار رفیق سے دریافت فرمایا۔

ما ابقیت لا هلک یا ابابکر۔ اے ابوبکر! اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ کر آیا ہے؟

(الجامع الترمذی' ۵:۶۱۵' کتاب المناقب' باب:۱۷' رقم:۳۶۷۵)

تو پروانہ چراغ مصطفوی ﷺ نے جو جواب دیا وہ حدیث کی کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ درج ہے۔

ابقیت لهم الله و رسوله۔ میں ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول چھوڑ آیا ہوں۔ (ایضاً)

صحابہؓ کی جناب رسالت مآب ﷺ سے ذاتی وابستگی و شیفتگی اور حضور ﷺ پر

ایمان اس درجے کا تھا کہ اثنائے گفتگو جب کوئی ایسا معاملہ زیر بحث آتا جس کے بارے میں انہیں علم نہ ہوتا تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتے **واللہ اعلم و رسولہ** اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔

واسطہ رسالت ہی توحید باری تعالی کی اولین و آخریں دلیل ہے:

خدا کی ذات واحد و یکتا ہے، لیکن اس امر سے کسی کو انکار نہیں کہ کوئی انسانی آنکھ خدا کے وجود کا مشاہدہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتی اور کسی میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنے ذاتی علم سے ذات باری تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کا ادراک اور عرفان حاصل کر سکے۔ چونکہ باری تعالیٰ کی توحید کا اثبات بغیر واسطہ رسالت ممکن ہی نہیں اس لئے جب بعثت کے بعد حضور ﷺ کفار و مشرکین مکہ کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپ ﷺ سے توحید باری تعالیٰ پر جو دلیل طلب کی اس کا جواب قرآن حکیم نے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے یوں کہلوایا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ O (یونس، ۱۰:۱۶)

بے شک میں اس (قرآن کے اترنے) سے قبل (بھی) تمہارے اندر عمر (کا ایک حصہ) بسر کر چکا ہوں سو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

حضور ﷺ نے توحید باری تعالی پر اپنی چالیس سالہ زندگی کو بطور دلیل پیش کر کے ایسا چیلنج دیا جس کا دنیائے کفر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آپ کی قبل از بعثت پوری زندگی کفار و مشرکین کے سامنے کھلی کتاب تھی جس کا کوئی ورق ایسا نہ تھا جس پر سیرت و کردار کا کوئی نقص اور دھبہ ہوتا۔ اگر آپ کی صاف و شفاف زندگی کے دامن پر کوئی داغ ہوتا تو معاندین حق کبھی اس کی اعلانیہ نشاندہی سے باز نہ

رہتے۔ لیکن آپ کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی بعثت مبارکہ سے قبل کی زندگی پر انگشت اعتراض بلند نہ کر سکا۔ اس طرح اثبات توحید پر حضور ﷺ کی حیات طیبہ اتنی بڑی دلیل اور برہان قاطع ہے کہ آج تک عالم کفر حمیت وقطعیت کے ساتھ اس کا رد نہیں کر سکا۔ بلاشک و ریب قرآن حکیم نے کفر و اسلام اور منافقت و ایمان کے باب میں حضور ﷺ کی ذات کو حتمی اور دائمی معیار کے طور پر پیش کیا ہے اور ایمان و اسلام کی پرکھ اسی حوالے سے ہو سکتی ہے۔ گروہ منافقین کی پہچان کراتے ہوئے قرآن حکیم ارشاد فرماتا ہے۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًاO (النساء، ۴:۶۱)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ (قرآن) کی طرف اور رسول (ﷺ) کی طرف آ جاؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کی طرف رجوع کرنے) سے گریزاں رہتے ہیںO

اس آیہ کریمہ میں منافقین کا یہ شیوہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ذات رسالت مآب ﷺ کی اطاعت و اتباع سے روگردانی اور انحراف کی روش اختیار کرتے ہیں۔

ایمان بالرسالت ایمان بالتوحید کے لئے لازمی شرط ہے:

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں کہ ذات رسالت مآب ﷺ پر ایمان لائے بغیر مجرد توحید باری تعالیٰ پر ایمان کا دعوی لغو اور بے حقیقت ہے۔ جب تک دہلیز مصطفوی ﷺ پر سر تسلیم خم نہ کیا جائے خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کا دعوی محض خام خیالی ہو گا چنانچہ جو کوئی توحید ہی کو اسلام اور ایمان کا مرکز و محور قرار دیتا ہے اس کا یہ فعل قرآن کی نظر میں منافقت متصور ہوتا ہے جو کہ کفر سے بھی بدتر ہے۔

قرآن حکیم نے ان بدباطن اور کج فطرت لوگوں کے بارے میں جو حضورﷺ کی ذات کو مطاع اور اپنے اختلافی معاملات میں بشرح صدر اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتے' بڑے واشگاف الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔

۱۔فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًاO (النساء،۴:۶۵)	پس (اے حبیب!) آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ مسلمان نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان واقع ہونے والے ہر اختلاف میں آپ کو حاکم بنالیں پھر اس فیصلہ سے جو آپ صادر فرما دیں وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور (آپکے حکم کو) بخوشی پوری فرمانبرداری کے ساتھ قبول کرلیں۔

حضورﷺ کی ذات گرامی تمام امت کے لئے مطاع کا درجہ رکھتی ہے اور ہر ایک پر بلا استثنا واجب ہے کہ آپ کی اطاعت بطیّب خاطر بجا لائے۔ارشاد ربانی ہے:

۲۔وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء،۴:۶۴)	ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ رسول کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا متصور نہیں کیا جا سکتا۔ارشاد ربانی ہے:

۳۔مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء ۴: ۸۰) جس نے اللہ کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا۔

ظاہر و باہر ہے کہ حضورﷺ کے حلقہ غلامی میں آئے بغیر جو کوئی ایمان کا دعویٰ کرے گا وہ اس کے منہ پر مار دیا جائے گا ایسے دعوی کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کا اپنے ذکر کے ساتھ اپنے حبیبﷺ کے ذکر کو ملزوم کر دینا اس بات کی بین دلیل ہے کہ ایمان و اتباع کے باب میں دونوں سے بیک وقت اور ایک ساتھ نسبت قائم کرنا ہی اسلام کا اساسی تصور ہے جسے دل و دماغ میں راسخ کرنا مبادیات ایمان میں سے ہے۔ اس تصور کو قرآن حکیم ایک اور مقام پر مزید وضاحت سے بیان فرماتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ○ (التوبہ ۹: ۶۲) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہے کہ اسے راضی کیا جائے اگر یہ لوگ ایمان والے ہوتے○

متذکرہ صدر آیہ کریمہ میں یہ بات خصوصی توجہ کی محتاج ہے کہ کلمہ یرضوہ میں ہ کی ضمیر واحد مذکر استعمال کی گئی ہے جبکہ اس سے پہلے آیت کے ٹکڑے میں اللہ اوررسول کا ذکر کیا گیا ہے اور عربی قواعد کی رو سے اس کے لئے صیغہ تثنیہ میں 'ھما' کی ضمیر آنی چاہئے تھی لیکن دونوں ہستیوں کے لئے ایک ہی ضمیر کا لانا اس امر کا غماز ہے کہ جب اللہ اپنے محبوب کا ذکر اپنی نسبت سے کر رہا ہے تو اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ کو راضی کرنا بدرجہ اولیٰ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس کے رسول کو راضی کیا جائے۔ قرآن حکیم نے یہ منفرد اور اچھوتا انداز اختیار کر کے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان دوئی کے ہر تصور کو کلیتاً ختم کر دیا اور قلبِ انسانی میں یہ

حقیقت جاگزیں کر دی کہ جب اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا معاملہ درپیش ہوتو دونوں حقیقت میں ایک ہی شمع کا پرتو ہو گا۔ اس بنا پر رسول کی ناراضگی خدا کی ناراضگی متصور ہو گی۔ اس نکتے کو قرآن حکیم ایک اور مقام پر انتہائی بلیغ اور جامع و مانع انداز سے بایں الفاظ بیان کرتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى O (النجم،۵۳:۳-۴)	اور وہ تو اپنی خواہش سے بولتا ہی نہیں وہ وہی کچھ کہتا ہے جو اللہ کی طرف سے اس پر وحی ہوتی ہے۔

یہ آیہ کریمہ بصراحت اس نکتے کو بیان کر رہی ہے کہ رسول مقبول ﷺ اپنی خواہش سے ایک لفظ بھی نہیں بولتے اور ان کی گفتار سراسر وحی الٰہی کے تابع ہے۔ اگر وہ کلام لفظی جبرائیل امین کے توسط سے ہے تو اسے وحی متلو اور قرآن کہیں گے۔ اگر وہ کلام نفسی جبرائیل کے واسطے کے بغیر ہے تو اسے وحی غیر متلو اور حدیث سے تعبیر کیا جائے گا۔ قرآن لفظاً اور معناً کلام الٰہی ہے۔ اس کے برعکس حدیث وہ کلام ہے جس کے معنی اللہ کی طرف سے القا ہوئے ہیں لیکن الفاظ حضور ﷺ کے اپنے ہیں۔ تاہم یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں علوم مصطفوی ﷺ کے مظہر و آئینہ دار ہیں اور ان کا سرچشمہ و منبع وحی الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کے بارے میں اللہ رب العزت کا یہ ارشاد غور و فکر کا متقاضی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۔ (التکویر،۸۱:۱۹)	بے شک یہ (قرآن) بڑی عزت و بزرگی والے رسول کا (پڑھاہوا) کلام ہے۔

یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ قرآن کو صاحب قرآن سے جدا نہیں کیا جا

سکتا۔

قرآن و سنت میں سے ایک کا انکار دوسرے سے انکار کے مترادف ہے:

قرآن کلام الٰہی ہے جبکہ سنت آنحضور ﷺ کے اقوال و افعال کا وہ مستند ریکارڈ ہے جس کی تدوین وتسوید احادیث مبارکہ کی صورت میں عمل میں آئی۔ بعض نام نہاد اہل علم اور کوتاہ نظر دانشور یہ کہہ کر احادیث کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن کافی ہے، ہمیں سنت مبارکہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ نادان اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ قرآن کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ حضرت جبرائیل کی وساطت سے حضور ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوا اور ہم نے آپ ﷺ کی سند پر بلا چوں و چراں قرآن تسلیم کرلیا۔ کیا کسی فرد بشر نے اپنی آنکھ سے حضرت جبرائیل کو حضور ﷺ کی طرف قرآن لاتے ہوئے دیکھا؟ اگر نہیں دیکھا تو کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس قول کو جس کی نسبت حضور ﷺ اپنی طرف کر رہے ہیں حدیث کہہ کر کم اہم سمجھے اور اس کی حجیت سے انکار کر بیٹھے، کم علموں کا یہ اندازِ فکر استدلال کی کمزوری پر مبنی ہے۔ ان کے پاس احادیث صحیحہ کی ثقاہت سے انکار کا کوئی عقلی و نقلی جواز نہیں ہے۔ ذخیرہ احادیث ہمارے اسلام اور اکابرین کی برسوں کی محنتِ شاقہ اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ ان کی اساس پر جو سنت مبارکہ مدون کی گئی اس سے تمسک کئے بغیر قرآن حکیم کے مطالب و معارف تک رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔

توحید و رسالت ایک ہی نورلم یزل کی شعاعیں ہیں:

دینِ اسلام کی حقانیت اور قرآن و سنت کی قطعیت و حتمیت کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ ایمان کے اس اساسی اور بنیادی تصور کو قلب و باطن میں جاگزیں کر دیا جائے کہ توحید و رسالت ایک ہی شمع کی کرنیں ہیں اور دونوں کے انوار ایک ہی

منبع و سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں۔ توحید باری تعالیٰ تک رسائی رسالت کے راستے ہی سے ممکن ہے اور یہی وہ منہاج ہے جو نوع انسان کو توحید باری تعالی کی منزل تک لے جاتا ہے۔ درِ رسالت پر پہنچے بغیر مجرد عقیدۂ توحید کا دعویٰ خام اور بے بنیاد و غیر معتبر ہے۔ رسول کی نسبت کو درمیان سے نکال دینے سے دین اسلام کی عمارت دھڑام سے نیچے گر جائے گی اور انسان ضلالت و گمراہی کے اندھیروں میں سرگرداں پھرتا رہے گا۔

عقیدۂ توحید کے باب میں قران حکیم حضرت یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ کرتا ہے کہ جب ان کے وصال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلا کر پوچھا۔

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ بَعۡدِیۡ۔ (البقرۃ‘ ۲:۱۲۳)	تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کرو گے؟

فرزندان یعقوب نے بیک زبان قرآنی الفاظ میں یوں جواب دیا۔

نَعۡبُدُ اِلٰهَکَ وَ اِلٰهَ اٰبَآءِکَ اِبۡرٰهٖمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (البقرۃ‘ ۲:۱۳۳)	ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے۔

بیٹوں کے اس جواب سے حضرت یعقوبؑ کی تسلی و تشفی ہوگئی۔ اس سے یہ عقدہ حل ہوا کہ انبیائے کرام کے واسطے کے بغیر کسی انسان کے لئے معبود حقیقی کی پہچان اور معرفت ممکن نہیں۔ اگر کوئی نبوت و رسالت کے بغیر خدا کی معرفت تک رسائی کی کوشش کرے گا تو وہ عقل و خرد کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر ضلالت و گمراہی کا شکار بن جائے گا۔

توحید و رسالت کا باہمی ربط و تعلق انتہائی نازک نوعیت کا ہے جس کی تفہیم میں بہت سے اہل فکر و نظر دھوکا کھا گئے اور منزل مقصود سے بھٹک کر دور ہو گئے۔

نسبت رسالت ۔ خدا کی نظر میں:

کائنات کے خالق و مالک کو اپنے محبوب ﷺ کی نسبت کتنی عزیز ہے؟ اس کا اندازہ بیعت رضوان کے واقعہ سے ہوتا ہے جب سرور دو جہاں ﷺ اپنے صحابہ سے بیعت لے چکے تو باری تعالیٰ نے ان کے حضور ﷺ ہاتھ پر بیعت کرنے کو قرآن حکیم کے الفاظ میں اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا قرار دیا' ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِینَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔
(الفتح' ۴۸:۱۰)

بیشک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی کی بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

اسی طرح غزوۂ بدر کے موقع پر جب حق و باطل کا معرکہ بپا ہونے والا تھا تو حضور ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں لشکر کفار کی طرف پھینکیں تو اللہ رب العزت نے حسب ارشاد قرآنی' کنکریاں پھینکنے کے اس واقعہ کو اپنی طرف منسوب کیا۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی۔
(انفال' ۸:۱۷)

(اے حبیب محتشم) جب آپ نے (ان پر سنگریزے) مارے تھے (وہ) آپ نے انھیں نہیں مارے تھے بلکہ (وہ تو) اللہ نے مارے تھے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ باری تعالی کو اپنے محبوب کی نسبت اتنی عزیز ہے کہ وہ آپ کے ہر قول و فعل کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں یہ نکتہ عقیدۂ توحید کی اساس ہے جس کو سمجھ لینے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ توحید و رسالت ایک ہی حقیقت ثابتہ کے دو جزو ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

حرف آخر

شہادت توحید و رسالت کی اس بحث کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ ایمان و اسلام وہی کامل ہے جس میں توحید کی منزل تک رسائی رسالت کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ واسطہ رسالت کے بغیر مجرد ایمان کا تصور انسان کو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے کہ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل زخواہد رسید

رسالت سے تعلق منقطع کر کے عقیدۂ توحید منافقت کے مترادف ہے جو خدا کی نظر میں کفر سے بھی بدتر ہے۔

باب چہارم

☆

مقام نبوت کی دو جہتیں

عبدیت اور رسالت

کلمہ شہادت میں ''عبدہ و رسولہ'' کے حوالے سے حضور اکرم ﷺ کی دو صفتوں اور جہتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک عبدیت اور دوسری رسالت' یہ دونوں صفتیں اور جہتیں آپ ﷺ کے مقام و منصب کی مظہر ہیں۔ حضور ﷺ کے مقام عبدیت کے باب میں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ اس دور زوال میں جب بگاڑ کے نتیجے میں علمی اور دینی تصورات اپنی اصل شکل اور ہیئت کھو چکے ہیں' لوگوں نے دین کو کھیل تماشا بنا لیا ہے۔ علم کی کمی اور نادانی و جہالت کے باعث لوگ اعلیٰ و ارفع تصورات و معتقدات کو بھی متنازعہ فیہ بنا کر ان کی عظمت سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کوتاہ نظروں اور کم فہموں نے حضور ﷺ کے بارے میں نور و بشر کا جھگڑا کھڑا کر کے آپ ﷺ کی عبدیت کو بشریت کے درجے پر لے آنا اور اپنا سارا زور بیاں آپ ﷺ کے بشر ہونے کو ثابت کرنے پر لگانا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ کتنی بڑی نادانی ہے کہ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ بشریت اور شے ہے اور عبدیت اور شے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ عبدیت کا مقام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ مجرد بشریت تو درکنار عالم بشریت و عالم نورانیت کے تمام کمالات بھی یک جا و مجتمع کر لئے جائیں' تب بھی وہ مقام عبدیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔

آنحضور ﷺ جب معراج سے سرفراز فرمائے گئے تو شب اسراری عالم بشریت کے جملہ کمالات بیت المقدس پر تمام ہو گئے اور عالم نورانیت کے مقامات و کمالات سدرۃ المنتہیٰ پر ٹھٹھک کر رہ گئے۔ لیکن پیکر محمدی ﷺ اپنے تمام تر جلوؤں کے ساتھ ''قاب قوسین'' پر حاوی ہو گیا۔ یہ شان شان عبدیت ہے جس کی ہمسری بشریت اور نورانیت مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ کی عبدیت ان الفاظ سے ظاہر ہے۔

فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی O (النجم، ۵۳:۱۰)

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہٴ (خاص) کو وحی کی جو وحی کی (جو اللہ نے چاہا)

جس کی حقیقی معرفت اور کنہ تک رسائی، نہ عالم بشریت کا کوئی فرد حاصل کر سکتا ہے اور نہ عالم نورانیت میں کسی کو اس کی کامل معرفت نصیب ہوسکتی ہے۔

باعتبار توجہ نبوت کی دو جہتیں:

سرور کائنات فخر موجودات علی صاحبہا التحیۃ والثناء کی ذات اقدس کی دو جہات، جہت عبدیت اور جہت رسالت، پیکر نبوت کی دو جہات کی نشانی دہی کرتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اپنے شرعی مفہوم کے اعتبار سے نبوت دو جہات سے عبارت ہے۔ ایک توجہ الی الخالق ہے اور دوسری توجہ الی الخلق، ذیل میں ان کا تذکرہ قدرے شرح و بسط سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ توجہ الی الخالق:

نبوت کا ایک رابطہ براہ راست بارگاہ الوہیت کے ساتھ ہوتا ہے وہ ربط و تعلق جو نبوت کو بارگاہ رب العزت سے ہوتا ہے اسے عبدیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۲۔ توجہ الی الخلق:

نبوت کی ایک جہت خالق کی طرف متوجہ ہونا ہے تو دوسری جہت مخلوق پر توجہ مرکوز کرنا ہے۔ گویا نبوت خالق اور خلق کے مابین باہمی رابطے کا ذریعہ اور واسطہ ہے۔ نبوت کا وہ ربط جو عالم خلق کے ساتھ استوار ہوتا ہے اسے رسالت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسالت عبارت ہے اس پیغام رشد و ہدایت سے، جسے لے کر کوئی نبی عالم بشریت میں مخلوق کی طرف آتا ہے۔

حضورﷺ کی ذات ستودہ صفات توجہ الی اللہ کی جہت میں بارگاہ الوہیت سے فیض حاصل کر کے توجہ الی الخلق کی جہت میں مخلوق خداوندی کو منتقل کر دیتی ہے۔ یہ عبدیت کا ربط جسے آج کا مادیت پرست انسان ایک معمولی چیز سمجھتا ہے نبوت کا عروج ہے۔ جب کہ نبی کی رسالت اس کی نبوت کا نزول ہے۔ یہ عروج اور نزول تصوف کی دو اصطلاحات ہیں جن سے ہمارے صوفیاء و عرفاء حضورﷺ کی نبوت کے دو کمال اور صفتیں بیان کرتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے۔

نبوت کی جہتِ عروج:

عروج کا مفہوم تمام بلندیوں اور رفعتوں کے مالک اللہ کی طرف جانا ہے اس میں تکمیل ذات کی صفت پائی جاتی ہے۔ برگزیدہ بندگان خدا میں کچھ حال مست ایسے بھی ہیں جو بارگاہ الوہیت میں جاتے ہیں تو اپنی ذات میں گم ہو کر وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تقرب الی اللہ کی منزل تک پہنچ کر اور اس کے فیوضات اپنے اندر جذب کر کے وہ عالم جذب و مستی میں لازوال حسن مطلق کے نظاروں میں اتنے منہمک و مستغرق ہو جاتے ہیں کہ اپنی اس حالت کو چھوڑ کر انہیں واپس پلٹنا گوارا نہیں ہوتا۔ یہ عروج کا وہ مقام ہے جس میں کچھ بندگان خدا مست ایسے سرشار و سرمست ہوتے ہیں کہ اپنے اوپر مجذوبیت کا لبادہ اوڑھ کر وہیں اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

نبوت کی جہتِ نزول:

عروج کے مقام پر اللہ کے کچھ خاص اور محبوب بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں مبداء فیض بہت بڑا ظرف دے کر پیدا کرتا ہے۔ وہ جب اپنی تکمیل ذات کا سفر طے کر لیتے ہیں تو بارگاہ خداوندی سے انہیں حکم ملتا ہے کہ اب اسی مقام

میں گم ہو کر نہ رہ جاؤ' بلکہ میری اس مخلوق کے پاس جاؤ جو پستی کے گڑھوں میں گری ہوئی ہے اور اس کا ربط و علاقہ مجھ سے کٹ چکا ہے۔ اس گری پڑی مخلوق کو پستیوں سے نکالنا اور اس کا تعلق پھر سے میری ذات کے ساتھ قائم کرنا تمہارا کام ہے۔

وہ محبوبان خدا جب بلندیوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہوتے ہیں تو متوجہ الی الخالق کے درجے پر فائز ہوتے ہیں اور جب وہ وہاں سے الوہی پیغام کے ساتھ واپس ہوتے ہیں تو متوجہ الی الخلق ہو جاتے ہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ایک صالح بزرگ ہو گزرے ہیں۔ وہ اس کی توضیح اپنی مثال سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام شب معراج مقام قاب قوسین پر پہنچے اور بارگاہ الوہیت سے حسن مطلق کا جلوہ کر کے واپس لوٹ آئے۔ اگر مجھے وہاں جانا نصیب ہوتا تو کبھی لوٹ کر نہ آتا۔ مقصد ان کا یہ کہنا تھا کہ عروج کے سفر میں تجلیات الٰہیہ سے سیراب ہونے کے بعد مجھے تکمیل ذات کی منزل تک رسائی نصیب ہو جاتی تو میں اس مقام سے ہلنے کا نام نہ لیتا یہ عروج کی کیفیت کمال واتمام کی مظہر نہیں۔ اس لئے کہ وہ جو اپنی ذات کی تکمیل ہی کو منزل مقصود سمجھتے ہیں ان کا کمال ناقص رہتا ہے۔

حضور ختمی مرتبت علی صاحبہا التحیۃ والسلام کا کمال اپنے لئے نہیں بلکہ تمام خلق کے لئے تھا۔ اس لئے کہ وہ خود تو مکمل تھے اور نامکمل انسانیت کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی

بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

(الموطا' ۲:۹۰۴' رقم:۸ کتاب حسن الخلق' باب ما جاء فی حسن الخلق)

اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ہی فضائل اخلاق کا منبع و مبداء ہیں اور

ساری اخلاقی قدریں آپ کے وجود پاک سے جنم لیتی ہیں۔ عالم بشریت میں انہیں ناتمام و نامکمل اخلاقی اقدار کے اتمام و تکمیل کے لئے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ کے عروج کے مقام پر پہنچ کر اس کی لذتوں اور کیف آفرینیوں میں بھی اپنی امت کو نہ بھولے اور اس لمحہ بھی جب بارگاہ خداوندی سے آپ کو تحفہ درود وسلام بھیجا جا رہا تھا' اپنی ذات میں مگن نہ ہوئے بلکہ اپنی امت کو بہمہ حال یاد رکھا۔ اس لئے کہ عروج کے بعد ان کا نزول بھی ہونا تھا۔ چونکہ نبوت کی یہ دونوں جہتیں اپنے کمال کی انتہا پر تھیں اس لئے آپ جلوۂ ذات حق میں مستغرق ہو کر خود فراموش نہ ہوئے بلکہ اپنی گنہگار اور عصیاں کار امت کو یاد رکھا۔

گنہگار اور صالح بندوں کو مژدۂ سلامتی:

معراج میں جلوہ ہائے حسن ایزدی کے روبرو بھی آپ اپنی معصیت کوش امت کو نہ بھولے۔ بارگاہ الوہیت سے جب آپ کو ہدیہ و ارمغان سلام'' **السلام علیک ایھاالنبی** '' کی صورت میں مل رہا تھا آپ خدا کا دامن رحمت تھام کر عرض پیرا ہوئے۔

''**السلام علینا و علی عباداللہ الصالحین**۔''

آپ نے سفارش فرمائی کی باری تعالی اپنے ان بندوں کو جو صالح ہیں سلامتی سے نواز دے اور رہ گئے وہ گنہگار بندے جو زمرہ 'عباد اللہ الصالحین' میں شامل نہیں ہیں اور نکوکاری و صالحیت کے فقدان کے باعث تیری سلامتی کے حقدار نہیں تھے انہیں میں اپنے ساتھ اپنی معیت میں شامل کر کے ان کی سلامتی کے لئے تیری بارگاہ بیکس پناہ میں درخواست گزار رہا ہوں۔ تو اپنے صالح بندوں کے درجات میرے سبب سے بلند کر دے اور وہ جو میری امت کے گنہگار ہیں انہیں بھی میری

محبت کے باعث اپنے دامن رحمت میں لے لے۔

عروج اور نزول کے حوالے سے یہاں یہ نکتہ بیان کرنا مقصود ہے کہ سیرت کے کمال کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ صاحب سیرت کی ذات اپنی تکمیل کے بعد دوسروں کے لئے نفع کا باعث بنتی ہے یا نہیں۔ وہ سیرت جس میں اپنی ذات کے مفاد ہی کو پیش نظر رکھا جائے مکمل سیرت نہیں گردانی جا سکتی۔ سیرت نبوی ﷺ کا پیغام یہ ہے کہ سیرت تب سیرت بنتی ہے جب انسان اپنے ذاتی مفاد جس میں سے خود پسندی اور خودغرضی کا پہلو نکلتا ہے' سے ماوراء ہوکر دوسروں کے مفاد اور منفعت کے بارے میں متفکر اور متردد ہونے لگے۔ انبیاء کرام کی سیرت ان نقائص اور خامیوں سے مبرا اور پاک ہوتی ہے جو عام دنیادار انسانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔

آنحضور ﷺ کی عبدیت کے پہلو میں جو عروج ہے اس سے آپ کی فوقیت وفضیلت کا ظہور ہوتا ہے' اور نزول میں آپ کی شان مثلیت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجئے کہ عروج میں چونکہ اللہ کی طرف جانا ہوتا ہے' اور طبیعت کا میلان اپنی ذات کی طرف زیادہ مرکوز ہوتا ہے' اس لئے اس میں فضیلت و فوقیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس نزول میں چونکہ نفع رسانی کے لئے توجہ اور دھیان دوسروں پر مرتکز ہوتا ہے اس لئے مثلیت یعنی اپنے جیسے ہونے کی شان کو نکھار ملتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ذات میں تکمیل نبوت کے لئے یہ دونوں شانیں یک جا ومجتمع کر دی گئی ہیں۔ اس لئے آج کے دور کم نہاد میں جہاں ہر کام افراط وتفریط سے عبارت ہے' بہت سی غلط فہمیوں نے جنم لے لیا ہے۔

حضور ﷺ کی مثلیت وفضیلت اور غلط فہمیوں کا ازالہ:

اس نکتہ کی تفہیم بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دے گی کہ جہاں عروج

فضیلت وفوقیت اور نزول مثلیت کے ظہور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہاں نبی اکرم علیہ والسلام کی ذات اقدس کے اندر دونوں شانیں اس طرح مجتمع کر دی گئی ہیں کہ ایک کو دوسری سے جدا اور الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے آپ کی ذات کو خلق خدا کے لئے مبداء ومصدر فیض بنانے کے لئے ضروری تھا کہ اس میں فضیلت اور مثلیت کی شانیں پہلو بہ پہلو یکجا رکھ دی جاتیں کہ اس طرح نبوت کا کام تکمیل کو پہنچتا ہے۔

نبی کی ذات کو دیکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اقرار اور دوسرے انکار کی آنکھ سے دیکھنے والے' ایک طرف ابوبکر صدیق؄ اور دوسری طرف ابوجہل کی آنکھ جب پیکر نبوت کو دیکھتی ہے تو دونوں پر فضیلت اور مثلیت کی شانیں عیاں ہوتی ہیں۔ چاند کا دو ٹکڑے ہونا نہ صرف ابوبکر؄' عمر؄' عثمان؄' علی؄ اور دوسرے غلاموں کو نظر آیا تھا بلکہ ابوجہل اور دوسرے معاندین کی آنکھیں بھی دیکھ رہی تھیں۔ لیکن جن کے دل میں روگ تھا ان کی نگاہ کو آپ ﷺ کی مثلیت کا وہ پہلو جس کا تعلق کھانے' پینے' شادی بیاہ' بازاروں میں چلنے پھرنے اور خوں بہنے وغیرہ کے معاملات سے ہے' نظر آتا تھا۔ لیکن دوسرا ہر پہلو وہ یکسر نظرانداز کر دیتے تھے۔ مثلیت کے پہلو پر وہ اس لئے زور دیتے تھے کہ اس سے نبوت کا انکار لازم آتا تھا۔

یہ بات وضاحت سے سمجھی جانے کے لائق ہے کہ کسی چیز کا اقرار کرنا اور بات ہے اور اس سے انکار کرنا اور بات' جب کسی ایک جہت پر اصرار ہوتا ہے تو لامحالہ وہ دوسری جہت کے انکار کو مستلزم ہوتا ہے۔ اب نبوت کا انکار کرنے والے دبی زبان سے فضیلت وفوقیت کو مانتے تو ہیں لیکن اصرار وہ مثلیت پر ہی کرتے ہیں۔ قرآن حکیم اس پر ان الفاظ سے استشہاد کرتا ہے۔

مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔	ہمیں تو تم ہمارے اپنے ہی جیسا ایک
(ھود' ۱۱:۲۷)	بشر دکھائی دیتے ہو۔

چونکہ مثلیت پر اصرار کرنے سے حضور ﷺ کے کمال نبوت کی نفی ہوتی ہے' اور نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔ ابوجہل اور اس کی قبیل کے لوگ دبے لفظوں میں پیکر نبوت کی فضیلت و فوقیت کا اقرار تو کرتے ہیں۔ مگر بہرحال ان کا اصرار آپ ﷺ کی مثلیت پر ہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابوبکرؓ اور دیگر پروانہ ہائے جمال مصطفوی ﷺ' عشاق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے حضور ﷺ کی مثلیت کا اقرار تو کرتے ہیں۔ لیکن ان کا اصرار آپ کی فضیلت پر ہی ہے۔ وہ مثلیت کا اقرار تو اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے کرتے ہیں۔ لیکن اصرار تمام تر آپ ﷺ کی فضیلت و فوقیت پر ہی کرتے ہیں۔ کہ قرآن حکیم میں خود حضور ﷺ کی زبان حق ترجمان سے دونوں شانیں بیان فرمائی گئیں ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ۔	فرما دیجئے میں تو صرف (بخلقت ظاہری) بشر ہونے میں تمہاری مثل ہوں (لیکن) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔
(الکہف' ۱۸: ۱۱۰)	

اگر قرآن حکیم کی روشنی میں حضور ﷺ کی ان دونوں شانوں کا کماحقہ ادراک ہو جائے تو بہت سی الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ یہ دین جھگڑوں اور مجادلوں کا محل نہیں۔ اس سے ملت اسلامیہ کو پہلے بہت نقصان پہنچ چکا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ اہل ایمان حضور ﷺ کی مثلیت و بشریت کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن آپ ﷺ کی فضیلت و فوقیت پر بغیر کسی ذہنی تحفظات کے اصرار کرتے ہیں کہ اس سے آپ ﷺ کا کمال نبوت متحقق ہوتا ہے۔ اوپر بیان کردہ آیہ کریمہ بغیر کسی ابہام کے یہ حقیقت بیان کر

رہی ہے۔ حضور ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ اے محبوب! لوگوں کو بتا دیجئے کہ میں نفس بشریت میں تمہارے جیسا تو ہوں کہ نبوت کی شان مثلیت کا یہی تقاضا ہے لیکن مجھ میں اور تم میں ''یوحی الی'' کا فرق ہے۔ لہٰذا تم مجھے محض اپنے جیسا نہ سمجھ بیٹھنا۔ میری شان فضیلت یہ ہے کہ مجھ پر پیکر بشریت میں خدا کا کلام بصورت وحی اترتا ہے۔ میرا قلب اطہر اللہ کے اس کلام کا محبط ہے جس کے متحمل پہاڑ بھی نہ ہو سکے اور جس امانت کا بوجھ کوئی فرشتہ یا اللہ کی دوسری مخلوق نہ اٹھا سکی۔

کلام الٰہیہ کی مثال تو پھولوں کی خوشبو کی سی ہے کہ جس کی صحبت اور ہم نشینی سے مٹی جیسی ناچیز شے بھی مہکنے لگتی ہے بقول سعدی شیرازیؒ مٹی زبان حال سے گویا ہوتی ہے۔

بگفتا من گل ناچیز بودم ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہم نشیں درمن اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

تو جس طرح مٹی پھولوں کی سنگت میں رہ کر معطر و معنبر ہو جاتی ہے اسی طرح کلام اللہ کی خوشبو جب پیکر بشریت میں رچ بس جاتی ہے تو ۲۳ سال تک اس سرمدی خوشبو سے ہمکنار رہنے سے اس کی کایا پلٹ جاتی ہے اور وہ پیکر بشریت اس تعلق کے نتیجے میں نورانیت سے بھی لطیف تر ہو جاتا ہے۔ وہ سب بشروں سے جدا اور متمیز ہو جاتا ہے پھر اسے عام بشر سمجھنا کم نظری اور کج فہمی کی دلیل ہے۔ اس پیکر بشریت کی لطافتوں کا عالم تو یہ ہو جاتا ہے کہ عالم بشریت تو درکنار عالم نورانیت کا کوئی فرد بھی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جن راستوں سے گزرتا ہے انہیں معطر کرتا جاتا ہے۔ نابیناؤں کو بینائی عطا کرتا ہے‘ ہاتھ کے صحت بخش لمس سے بیماروں کی مسیحائی ہوتی ہے اور مردوں کو حیات نو ملتی ہے۔

مثلیت اور فضیلت حضور ﷺ کی دو شانیں ہیں جن میں بتقاضائے ایمان

فضیلت کو برتری اور فوقیت حاصل ہے کہ حسب ارشاد ربانی:

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ (البقرة، ۲:۲۵۳)

یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

انبیاء و رسل میں فضیلت کی بات کرتے ہوئے قرآن حکیم آگے اس کی توجیہہ یوں بیان فرماتا ہے۔

مِنْهُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔ (البقرة، ۲:۲۵۳)

ان میں سے کسی سے اللہ نے (براہ راست) کلام فرمایا اور کسی کو درجات میں (سب پر) فوقیت دی۔

محولہ بالا آیہ کریمہ میں جہاں جزوی فضیلت کا بیان ہوا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باب میں ذکر کیا گیا کہ انہیں دوسرے انبیاء کے مقابلے یہ فوقیت ملی کہ ان سے اللہ نے کلام کیا اور کلیم اللہ کے لقب سے معنون ہوئے وہاں آیت کے دوسرے حصے ''ورفع بعضھم درجات'' میں کلی فضیلت کا معنی بھی مذکور ہے۔

مثلیت وفضیلت کی جہتیں اور ایمان کا تقاضا:

اہل ایمان کو اگر ایمان بالرسالت کا حق ادا کرنا ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ حضور ﷺ کی مثلیت کو نبوت کی ایک شان سمجھ کر اس کا اقرار کریں۔ لیکن دھیان نبوت کی شان فضیلت وفوقیت کی طرف ہی رہے کہ اسی سے کمال نبوت کی معنویت قلب و دماغ میں جاگزیں ہوسکتی ہے۔ اگر دھیان مثلیت کی طرف ہی رہا تو جان لیجئے کہ اس سے کمال نبوت کی نفی ہو جائے گی اور آپ کا خرمن ایمان غارت ہو

جائے گا۔

اللہ جل مجدہ نے اپنے محبوب ﷺ کو یہ دو شانیں کیوں عطا فرمائی ہیں۔ اس نکتے کی تفہیم اس مثال سے ہوسکتی ہے کہ فیض دینے اور فیض لینے والے کے درمیان ایک مناسبت اور متجانست ومماثلت کا ہونا ضروری اور لابدی ہوتا ہے۔ جس طرح پرائمری جماعت کے طلباء کو امریکہ یا لندن پلٹ' پی ایچ ڈی عالم فاضل سطح میں اتنا بڑا فرق ہونے کی بنا پر وہ فیض نہیں پہنچا سکتا جو ایک عام درجے کا استاد خواہ وہ P.T.C. ہی کیوں نہ ہو پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر نبی کی شان میں مثلیت کا عنصر ہوتا تو ایک حد تک متجانست ومماثلت نہ ہونے کی وجہ سے مخلوق فیض حاصل نہ کرسکتی۔ اس لئے باری تعالی نے اپنے محبوب ﷺ کو قاب قوسین او ادنیٰ کے مقام پر ''عروج'' سے ہمکنار فرمایا' لیکن چونکہ مقصد محض آپ ﷺ کی عظمت کو برقرار رکھنا نہ تھا بلکہ اس فیض کو عام مخلوق خدا تک منتقل کرنا تھا اس لئے آپ ﷺ کو ''نزول'' کا درجہ بھی عطا فرما دیا تاکہ مخلوق کی سطح کے قریب ہوکر یک گونہ مثلیت پیدا ہو جائے۔ گویا حضور ﷺ کو مثلیت کا عطا کیا جانا بندوں پر ایک قسم کا احسان تھا ورنہ عظمت مصطفیٰ ﷺ کا مقام پوچھنا چاہتے ہو تو جان لیجئے کہ ان کا قد و قامت اتنا بلند تھا اور ہے کہ جبرائیل ان کے قدموں کے تلووں کو بھی نہ چھو سکے۔ وہ تو اپنی گنہگار امت کی خاطر اس لئے جھک کر اس کے قریب آئے' شادیاں کیں' عیال دار ہوئے' دانت شہید کرائے اور اپنے جسم اطہر کو لہولہان کیا تاکہ غیریت اور بیگانگی کا احساس باقی نہ رہے اور باہمی میل ملاپ کی صورت میں فیض نبوت منتقل کیا جا سکے۔

مقام مصطفویﷺ کی وضاحت کے لئے ایک مثال:

اس ضمن میں ایک مثال کے ذریعے اس نکتے کو بآسانی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی غریب آدمی اپنی حاجت لے کر کسی بڑے صاحب منصب شخص کے دروازے پر جاتا ہے۔ دستک دینے پر وہ شخص باہر آتا ہے' اس کا مدعا پوچھتا ہے اور کھڑے کھڑے اس کا کام نپٹا کر اسے فارغ کر دیتا ہے اور گھر کے اندر چلا جاتا ہے۔ اس غریب کے واپس جانے پر لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ تم نے اس بڑے آدمی کو کیسا پایا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ جس مقصد کے لئے میں اس کے پاس گیا تھا اس نے پورا تو کر دیا لیکن جس انداز سے وہ مجھے ملا اس سے بڑائی' تکبر و رعونت اور نخوت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکن' گردن میں اکڑاؤ اور چہرے پر خشونت آمیز سنجیدگی تھی۔ میں دوبارہ اس کے پاس جانے سے پہلے کئی بار سوچوں گا۔

وہی غریب آدمی ایک اور صاحب حیثیت و مرتبہ شخص کے پاس کسی کام سے جاتا ہے اور لوگوں کے استفسار پر اس کے احوال یوں بتاتا ہے کہ 'اس نے اپنے طرز عمل اور گفتار و کردار سے میرا دل موہ لیا ہے۔ وہ مجھے انتہائی خندہ پیشانی اور تپاک سے ملا۔ مجھے عزت سے بٹھایا اور میری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس نے نہ صرف میرا کام کر دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ آئندہ جب کبھی ضروری پڑے بلا تکلف قدم رنجہ فرمائیے گا۔

اس سے یہ نکتہ کھلا کہ اصل بڑائی تواضع اور جھک کر ملنے میں ہے۔ حضور ختمی مرتبتﷺ کائنات کی عظیم ترین ہستی ہونے کے باوصف جب عامیوں سے جھک کر ملتے ہیں تو سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ان کا کرم اور ان کی محبت و رافت ہے ورنہ وہ ذات تو ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' کی مصداق ہے۔